نظموں کا در کھلتا ہے

(1990ء کے بعد کے 20 نمایاں شعرا کی منتخب نظمیں)

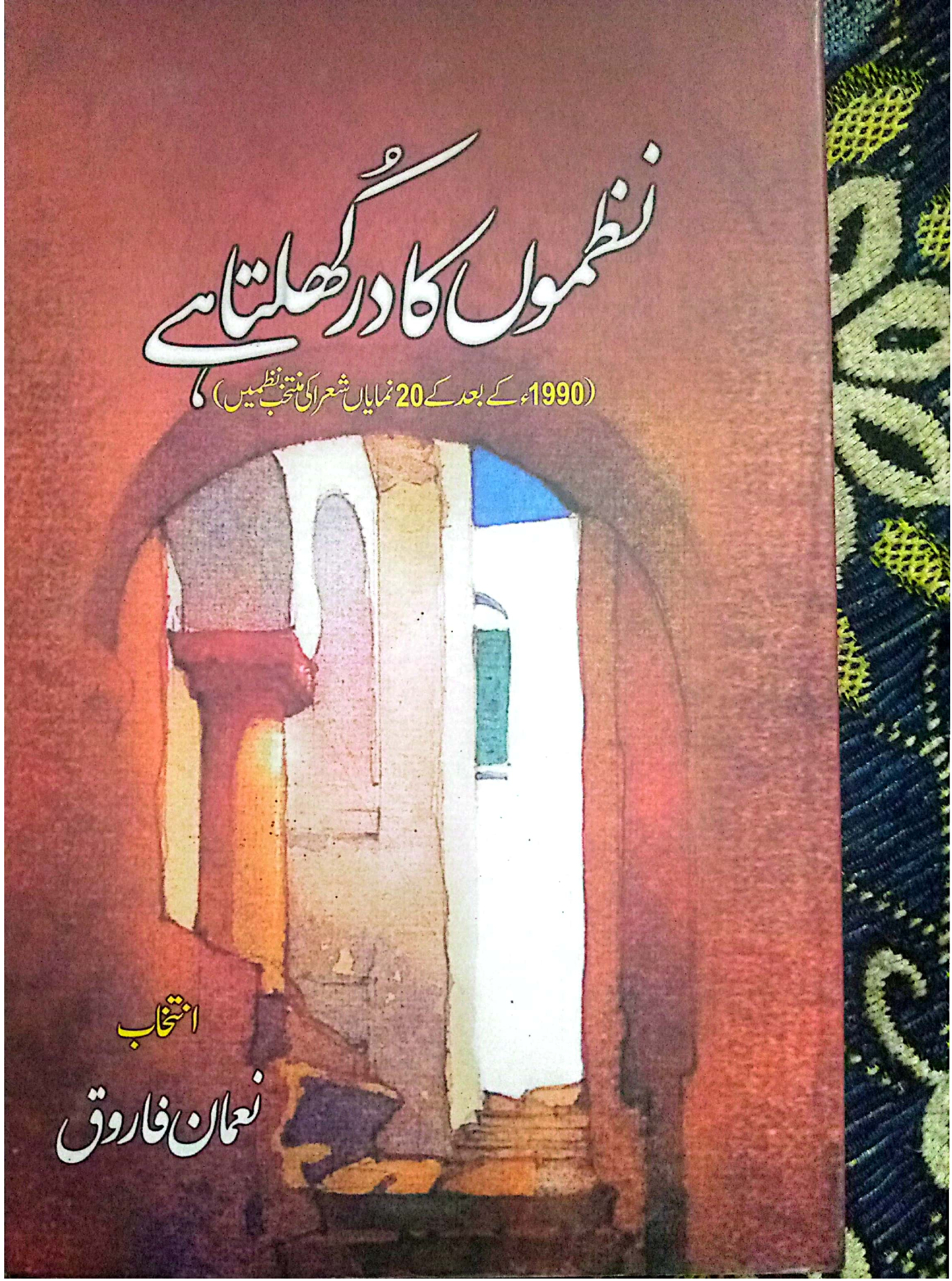

انتخاب

نعمان فاروق

CamScanner

جملہ حقوق محفوظ ©

اشاعت اوّل : 2017
کتاب : نظموں کا در کھلتا ہے
انتخاب : نعمان فاروق
ناشر : محمد عابد
قیمت : 500 روپے
مطبع : بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

Nazmon Ka Dar Khulta Hai
by
Noman Farooq
Edition November 2017

اہتمام
مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
Ph:+92-41-2615359, 2643841, Cell: 0300-6668284
E-mail: misaalpb@gmail.com

شوروم
مثال کتاب گھر، صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

انتساب

مراقبے کو عبادت سمجھنے والوں کے نام

یوں تو وصال یار کی ساعت بھی خوب تھی
لیکن مراقبے کی گھڑی اور چیز ہے

(نعمان فاروق)

CamScanner

فہرست

اپنی بات	نعمان فاروق	09
ارشد معراج		15
الیاس بابر اعوان		27
پروین طاہر		39
تابش کمال		51
خلیق الرحمان		63
دانیال طریر		75
داؤد رضوان		87
رفعت اقبال		99
روش ندیم		111
سرمد سروش		123
سعید احمد		135

CamScanner

شہزاد تیر	147
عامر سہیل	159
عصمت حنیف	171
علی اکبر ناطق	183
فرخ یار	195
فہیم شناس کاظمی	207
ناہید قمر	219
نینا عادل	231
یامین	243

اپنی بات

''غزل زندہ رہے گی'' کے بعد ''نظموں کا در کھلتا ہے'' پیش خدمت ہے۔

میں نے ''غزل زندہ رہے گی'' کے دیباچے میں عرض کیا تھا کہ انتخاب سراسر ذوقی معاملہ ہے اور ہر شخص اپنے فہم اور ذوق کے مطابق ہی انتخاب کرتا ہے۔ جس سے ہر کسی کو اختلاف کا حق ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ''غزل زندہ رہے گی'' کو بہت سنجیدگی سے لیا گیا بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس سے اختلاف تو کیا لیکن کسی نے اسے کلیتہً رد نہیں کیا۔ سب سے زیادہ اختلاف میرے ان دوستوں نے کیا جو خود شاعر تھے اور ان کا تعلق بھی نوے کی دہائی کے بعد ابھرنے والے شعرا میں ہوتا ہے لیکن انھیں اس انتخاب میں جگہ نہیں مل سکی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک فطری بات ہے۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ ابھی تک اس کتاب کا ذکر کسی نہ کسی صورت میں چل رہا ہے۔

ہاں یہ الگ بات ہے کہ اگر اسے یک سر نظر انداز یا رد کر دیا جاتا تب میں نظم کا انتخاب ضرور کرتا کہ اچھی شاعری ہمیشہ میری ذات کا مسئلہ رہی ہے اور میں جو انتخاب کرتا ہوں وہ کسی کو خوش یا ناراض کرنے کے لیے نہیں بل کہ اپنی ذات کی تکمیل کے لیے کرتا ہوں کہ شعر کے بغیر میری ذات نامکمل ہے۔

CamScanner

شہزاد تیر	147
عامر سہیل	159
عصمت حنیف	171
علی اکبر ناطق	183
فرخ یار	195
فہیم شناس کاظمی	207
ناہید قمر	219
نینا عادل	231
یامین	243

اپنی بات

''غزل زندہ رہے گی'' کے بعد ''نظموں کا در کھلتا ہے'' پیش خدمت ہے۔

میں نے ''غزل زندہ رہے گی'' کے دیباچے میں عرض کیا تھا کہ انتخاب سراسر ذوقی معاملہ ہے اور ہر شخص اپنے فہم اور ذوق کے مطابق ہی انتخاب کرتا ہے۔ جس سے ہر کسی کو اختلاف کا حق ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ''غزل زندہ رہے گی'' کو بہت سنجیدگی سے لیا گیا بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس سے اختلاف تو کیا لیکن کسی نے اسے کلیتہً رد نہیں کیا۔ سب سے زیادہ اختلاف میرے ان دوستوں نے کیا جو خود شاعر تھے اور ان کا تعلق بھی نوے کی دہائی کے بعد ابھرنے والے شعرا میں ہوتا ہے لیکن انھیں اس انتخاب میں جگہ نہیں مل سکی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک فطری بات ہے۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ ابھی تک اس کتاب کا ذکر کسی نہ کسی صورت میں چل رہا ہے۔

ہاں یہ الگ بات ہے کہ اگر اسے یک سر نظر انداز یا رد کر دیا جاتا تب میں نظم کا انتخاب ضرور کرتا کہ اچھی شاعری ہمیشہ میری ذات کا مسئلہ رہی ہے اور میں جو انتخاب کرتا ہوں وہ کسی کو خوش یا ناراض کرنے کے لیے نہیں بل کہ اپنی ذات کی تکمیل کے لیے کرتا ہوں کہ شعر کے بغیر میری ذات نامکمل ہے۔

جہاں اختلاف کی بات ہے تو اڑھائی سو سال گزرنے کے باد جو لوگ آج تک میر تقی میر کے "بہتر نشتروں" پر متفق نہیں ہو سکے۔ اور جب سے باقیات کلام غالب چھپی ہے (اور یہ بھی پوری صدی کا قصہ ہے پل دو پل کی بات نہیں) لوگ غالب کے اپنے منتخب کردہ دیوان سے بھی اختلاف کر رہے ہیں کہ وہ ایک عظیم شاعر تو تھے لیکن وہ "اچھے شعری ذوق" کے حامل نہیں تھے۔ خود مجھے بھی یہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے کہ انھوں نے اپنے اس بڑے شعر کو بھی دیوان میں جگہ نہیں دی:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

بہت سے ناقدین نے اس کی وجہ تنافر بتائی ہے۔ لیکن میں ذاتی طور پر ایسا نہیں سمجھتا کیوں کہ غالب کے اپنے انتخاب کردہ دیوان میں بیسیوں ایسے اشعار موجود ہیں جو تنافر کی بدترین مثال ہیں۔

میرے خیال میں اساتذہ کے نزدیک یہ کوئی ایسا عیب نہیں تھا جس سے بچنے کے لیے وہ خیال کا خون کرنے پر تل جاتے۔ تنافر کا شہرہ تو حسرت موہانی نے زیادہ بلند کیا انھوں نے ہی بہت سے ایسے عیوب کے خلاف "جہاد" کا علم بلند کیا ورنہ اس سے پہلے کی کتابوں میں یہ ایک معمولی عیب تھا۔ خیر بات ہو رہی تھی غالب کے "ذوق" کی تو اس معاملے میں سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے: ع شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا ہے

اگر غالب کو شعروں کا انتخاب رسوا کر سکتا ہے تو میری کیا اوقات۔

جہاں تک اس موجودہ انتخاب کا تعلق اس کے لیے مجھے غزل کے انتخاب سے بھی زیادہ محنت کرنا پڑی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل چوں کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ سننے کی بھی چیز ہے اور مشاعروں کی جان ہے اس لیے غزل کے اچھے شاعر عموماً ایک حد تک معروف بھی ہوتے ہیں اور ان کی کتابیں بھی بآسانی دستیاب ہوتی ہیں۔ نظم کو چوں کہ ابھی عوامی سطح پر

پذیرائی حاصل نہیں ہوئی اس لیے ان کی کتابیں بھی ایک خاص حلقے تک محدود ہوتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں غزل کے اچھے برے انتخابوں کی بھرمار ہے وہاں نظم کا کوئی اچھا تو کیا برا انتخاب بھی مشکل ہی سے ملتا ہے۔ سوائے خواجہ زکریا کے انتخاب زریں کے، جو بہت پہلے مرتب کیا گیا تھا اور کلاسیکی شعرا سے لے کر ستر تک کی دہائی کے نظم گو شعرا کا احاطہ کرتا ہے، کم از کم میری نظر سے نظم کا کوئی اچھا انتخاب نہیں گزرا۔ البتہ بعض ادبی رسائل نے نظم ضرور شائع کیے ہیں لیکن ان میں بھی نئے شعرا کو کم کم ہی جگہ مل پائی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ میں نے یہ انتخاب نوے کی دہائی کے بعد ابھرنے والے شعرا تک محدود کیوں رکھا ہے تو اس کا ایک جواب تو وہی ہے کہ جو میں نے غزل کے انتخاب کے سلسلے میں عرض کیا تھا کہ ان سے پہلے کے شعرا پر کچھ نہ کچھ کام ہو چکا ہے لیکن نوے کی دہائی کے شعرا کی طرف ابھی تک کسی نے توجہ نہیں دی۔ جہاں تک اس کے پاکستانی شعرا تک محدود ہونے کی بات ہے تو چوں کہ بھارت میں لکھی جانے والی نظم پر میری کچھ زیادہ نظر نہیں ہے اس لیے مجھے احتمال تھا کہ کہیں وہاں کا کوئی اہم شاعر رہ نہ جائے اور بعد میں مرا ضمیر مجھے کچوکے لگاتا رہے۔ پاکستان کے شعری منظر نامے سے میں اپنی بساط کے مطابق آگاہ ہوں اس لیے مجھے اپنی حد تک تسلی ہے کہ میں نے یہ انتخاب ساری شاعری کو پڑھ کر کیا ہے۔ جہاں تک دوسروں کو مطمئن کرنے کی بات ہے تو یہ میرا مسئلہ ہی نہیں۔

یہ سوال کہ کیا نوے کی دہائی کی نظم اپنے خدوخال واضح کر چکی ہے یا نہیں اس کا جواب آپ اس انتخاب کے ذریعے خود ہی تلاش کر سکتے ہیں۔ ان منتخب شعرا کے میں سے بہت سے اپنی ایک علاحدہ شناخت قائم کر چکے ہیں اور کچھ اپنے شناخت بنانے میں مصروف ہیں میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ بیشتر شعرا اپنی لفظیات، اپنے اسلوب، اپنے موضوعات اور اپنے رنگ ڈھنگ کے حوالے سے اپنے پیش رو شعرا سے مختلف ہیں۔ تاہم ان کی شناخت کے مکمل خدوخال دیکھنے کے لیے ہمیں ابھی مزید دس سال انتظار کرنا پڑے گا۔

اس انتخاب کو مرتب کرتے ہوئے بھی میں نے کم و بیش وہی باتیں مدنظر رکھیں جو غزل گو شعرا کا انتخاب کرتے ہوئے میرے پیش نظر تھیں کہ میرے نزدیک تخلیق، تخلیق ہی ہوتی ہے چاہے اس کی ہیئت کوئی بھی ہو۔ جس طرح شعر کو سب سے پہلے شعر ہونا چاہیے اس کے بعد ہم نے دیکھنا ہے کہ اس میں خیال کی سطح بلند ہے یا پست اسی طرح میں جب کسی نظم کو پڑھتا ہوں تو سب سے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ یہ

نظم ہے یا نہیں۔ اگر وہ نظم ہے تو پھر اس کی تخلیقی سطح کے بارے میں سوچتا ہوں۔ چوں کہ یہ انتخاب نظم گو شعرا کا اس لیے میں نے اس میں صرف انھی لوگوں کو منتخب کیا ہے جو صرف اور صرف نظم کے حوالے سے ایک علاحدہ شناخت رکھتے ہیں اگر ایک شاعر بنیادی طور پر غزل کا ہے اور اس نے نظم بھی اچھی کہی لیکن نظم اس کی شناخت کا بنیادی حوالہ نہیں ہے تو میں نے اسے زیر غور ہی نہیں لایا کہ میں چاہتا تھا کہ اس انتخاب میں نظم ہی کے زیادہ سے زیادہ شعرا جگہ پا سکیں۔ اس سلسلے میں بطور خاص اختر رضا سلیمی، حمیدہ شاہین اور رانا سعید دوشی کے نام لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے اچھی نظمیں کہہ رکھی ہیں اور معیار کلام کے لحاظ سے ان کی اس میں جگہ بنتی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اگر میں انھیں بھی زیر غور لے آتا تو تین چار ایسے نام اس مجموعے سے خارج کرنا پڑتے جو شاید ان کی سطح کے نظم نگار نہ ہو لیکن ہیں بنیادی طور پر نظم نگار ہی اور ان کی اول و آخر شناخت نظم ہی ہیں۔

میرے اس نقطہ نظر سے آپ اختلاف بھی کر سکتے ہیں جو آپ کا حق ہے۔

غزل کے انتخاب کی طرح اس میں بھی بے شمار لوگ شامل ہونے سے رہ گئے جو یقیناً گلہ مند بھی ہوں گے۔ بہر حال چوں کہ میں نے صرف بیس شعرا کا انتخاب کرنا تھا اس لیے باقیوں نے تو یہ رہ ہی جانا تھا۔

اب آخر میں اس کی ترتیب کے حوالے سے بھی ایک ضروری وضاحت کر دوں کہ میرا ارادہ تو یہی تھا کہ اپنے پہلے انتخاب کی طرح اس کی ترتیب بھی شعرا کے کلام کے معیار کے

حوالے سے متعین کروں لیکن پھر ارادہ بدل دیا اور حروفِ تہجی کے لحاظ سے ہی ترتیب رکھنا مناسب سمجھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں: اول یہ کہ بہت سے دوستوں نے اصرار کیا کہ آپ کا کام صرف بیس شعرا کو منتخب کرنا ہے کون کس نمبر پر ہے اس کا فیصلہ آپ قارئین پر چھوڑ دیں۔ دوسرا نظم کے شعرا میں کئی شعرا ایک ہی سطح کے ہیں اور ان کے بارے میں فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کیوں کہ اگر ایک شاعر فنی طور پر مضبوط ہے تو دوسرے کے ہاں موضوعات کا تنوع زیادہ ہے۔ اس لیے اب کی بار میں نے سوچا کہ ترتیب کا فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیتا ہوں۔

مجھے امید ہے کہ غزل زندہ رہے گی کی طرح یہ انتخاب بھی آپ کو پسند آئے گا۔

نعمان فاروق

ارشد معراج

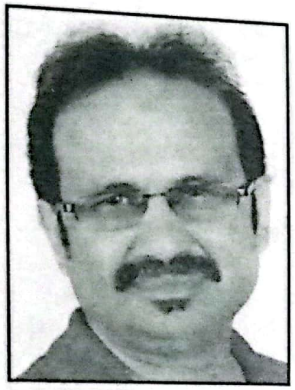

نام: ڈاکٹر ارشد محمود آصف

قلمی نام: ارشد معراج

ای میل: dr.arshad@iiu.edu.pk

فون نمبر: 0300-5168823

تصانیف: کتھا نیلے پانی کی

فرحت پروین کی افسانہ نگاری (تجزیاتی مطالعہ)

غیرت کے نام پر قتل (شریک مصنف)

رُت بدلنے کے بعد

دیکھنا اک دن برف پڑے گی
اور خوابوں کی پلکوں پر بیٹھی حیرانی
ویرانی ہو جائے گی
نیلے پانی پر برفیلی سرد ہوائیں جامد ہو کر
کانچ کے آنسو بن جائیں گی
شکلیں چہرے اور زبانیں
حرف سلوک ملوک مناظر
ایک کتھا بن جائے گی
یہ جو اندر ہول اُٹھتا ہے
ٹھنڈا ٹھار سا ہو جائے گا
تیرے میرے بیچ کی حدت
آنکھوں میں جم جائے گی

☆☆☆

تنہائی کی شاخ پر جھولتی نظم

میں کہ پائیں باغ کے کونے میں دُبکا
رات کی ٹہنی پر لٹکا دیکھتا ہوں اک گلاب
دل کا دامن بھر گیا ہے داغ سے
کس تمنا کا ٹھٹھرتا لمس ہے چاروں طرف
آرزوؤں کا تماشا خواہشوں کی دھند میں
لہلہاتے رقص کرتے سایے ہیں کس کے لیے
روشنی تالاب میں اک عمر سے ڈوبی ہے کیوں
گہری تاریکی میں لکھی ہجر کی آیت زباں پر ہے
مگر آواز آتی ہی نہیں

کون جانے
کیوں ہیں ٹھنڈے ہاتھ پاؤں
آگ کیسے بجھ گئی
کیوں تھکن مسکن بنی ہے جسم کا
کیوں بدن لمبی کہانی ختم کرتا ہی نہیں
خاک کرتی نظم ہے کاغذ پہ جو آتی نہیں
سامنے ہے یاد پر کیوں یاد آتی ہی نہیں
کیوں بھٹکتا ہے یہ مصرع خواہشِ تہذیب میں
کون سانسوں کی اقامت گاہ تک آیا نہیں
شاخ پر بیٹھا ہوا اُلو مسلسل بولتا ہے کس لیے
(علی محمد فرشی کے لیے)

کچے رنگ تعلّق والے

بھولے باشہ
جیون کوئی سیدھی پگڈنڈی تھوڑی ہے
جس پر جیسے چاہو گے تم سرپٹ دوڑے جاؤ گے
لاکھوں موڑ جدائی والے ہر ہر موڑ پر آجاتے ہیں
چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے
ہر ہر جا پر ہاتھ ملاتے
گرتے پڑتے ٹوٹتے بنتے
پیار سلامت کہتے کہتے
چہرے رُوپ بدل جاتے ہیں
کچے رنگ تعلّق والے
داغی جُثہ کر جاتے ہیں
رہ جاتے ہیں واورولے
پتے، مٹی، دھول اور کاغذ
ہر کاغذ پر سو سو سطریں
ان سطروں میں نئی کہانی
(وہی پرانی)
بھولے باشہ!
صحرا، پیلو اور مٹیاریں
لمبے سانسوں کی باتیں ہیں
☆☆☆

ذلّت کا سوانحیہ

ہمیں یاد ہی کب رہا
کہ ہم روشنی کو نگاہوں میں بھر کر
وقت کی سیڑھیوں پر
بہت دھیرے دھیرے سے چڑھتے رہے
سانس پھولا مگر پھر بھی ہشاش تھے
آسماں کی کہانی کہیں اور لکھی گئی تھی
عقوبت کے ملبے پے
گھوڑوں کے سُم سے جو نقشے بنائے
ہمارے بدن تھے
زمانہ جو چالوں پہ چالیں بدلتا رہا
اور مکڑی کے جالے بناتا رہا
ہم نوالہ تر
چاروں اطراف سے ایسے گھیرے گئے
سانس مشکل ہوئی
اور تشنج زدہ جسم پھڑ پھڑ کنے لگا
ایک کے چار دِکھنے لگے
کیسا بھیجے میں گھمسان کا رن پڑا
ساری محنت ہی تلپٹ ہوئی
جس کے پیچھے ہزاروں برس کی ریاضت تھی وہ
ایک لمحے میں سب بے ہنر ہوگئی
ناک منہ کان میں خاک ہی خاک تھی

ہم جو ہمت پکڑنے لگے
ہاتھ آئی نہیں
دھول اتنی اُڑی
کہ نظر کے سبھی زاویے منتشر ہوگئے
آسماں کی طرف منہ اٹھایا
تو بیگانگی کی صدائیں سنیں
ہم جو مٹی سے تھے
اور آوے میں پکتے رہے
خاک میں مل گئے
ہم پھلاہی پہ اٹکی ہوئی لیر تھے
رفتہ رفتہ جسے خاک ہونا تھا
رنگت بھی کھونا تھا
اور خاک میں خاک ہونا تھا
سو خاک ہوتے رہے
پر یہ اندر جو الاؤ تھا
خاک ہونے سے انکار کرتی ہے
اور اپنے ہونے پہ اصرار کرتی ہے اب
سو اذیت دُکھن دوہری تلوار کی دھار پر
موت اور زندگی کا طلاطلم ہے
جاری جور کتا نہیں
اپنی تذلیل کو بھولتا ہی نہیں

☆☆☆

زمیں زاد

وہی ابتداء
وہی فاصلے
مرے رُوبرو مرے راستے
میں جہاں رہا میں وہاں نہ تھا
وہی کھینچ کر مجھے لے گئے تھے
فرات و دجلہ کے نام پر
جو سوار آئے تھے دُور سے
(مری فصل ساری وہ کھا گئے)
مرے نام جو بھی رقم ہوئے
مری اصل کیا تھے وہ رابطے۔۔۔۔؟
مرے تن بدن
مرے نطق کے جو تھے ذائقے
وہ کہاں گئے۔۔۔۔؟
جو زمین سے پاؤں اٹھا لیئے
تو یہ خاک کیسے پناہ دے
مری راہ کیسے ہری رہے
میں ہوں دم بخود کروں کیا گلہ

مرا سر نگوں کھلے آسماں!
میں غلام تھا، میں غلام ہوں
تری تیز آنکھوں کے پانیوں میں جو بہہ گیا
جو الاؤ تھا ترے پیار کا
وہ بھی بجھ گیا
مری شام نگری میں شام ہے

☆☆☆

حرف جلے

حرف سمندر نیل و نیل
باہر خشکا میل و میل
حرف نمانے کوئی نہ جانے
حرفوں کی اپنی بپتا ہے
ورقہ ورقہ خون کے چھینٹے صدیاں چاٹیں
نیل گگن کے دھاگے کاٹیں
صبح سنہرے رات کو کالے
کالے پھیر شُو کے جائیں
جنم، جنم کے جنم جلے یہ ڈوبو ریت میں ڈوبے جائیں
چاروں اور صدائیں گونجیں
اندر باہر، باہر اندر
بنیں تماشہ، ایک بتاشہ
ان کے کاندھے، ان کا لاشہ
ایک جمائی ہے یہ خدائی
حرفوں کی سو کیا شنوائی

☆☆☆

تو بتا تا نہیں.....

تُو بتاتا ہے سب کو مجھے بھی بتا.....؟
حوصلہ ہے تو کر ابتدا ـــــ!!!
زندگی کس طرح مجھ پہ نازل ہوئی
کیسے مانوس ہو گی حسیں وحشیہ
(یہ پرندہ کسی طور بھی دام میں اپنے آیا نہیں)
تُو بتا ـــــ
جانے والوں کے قصے، فسانے، زمانے پرانے سبھی
آنے والے دنوں کی کہانی بتا.....
چکرورتی ـــــ یہ دھرتی کا قصہ ہے کیا؟
آبگینوں ـــــ سفینوں کا ناتا ہے کیا؟
رات اور دن ـــــ مہینوں کی بپتا ہے کیا؟
کیوں زمانوں کا چرخہ الٹ چال چلتا نہیں؟
اور مکافات شکلیں بدلتا نہیں؟
کیوں مضافات میں عشق لازم ہوا؟
اور مرے ہاتھ پہ لفظ ہجرت اُگا؟
کیسی یہ ریت ہے جو اُڑی ہی نہیں؟
پھر بھی منہ میں بھرے پھر رہا ہوں اسے
کیسی یہ خاک ہے؟
جو بدن کا برادہ بنی بھی نہیں

نا کوئی چاک ہے نا کوئی چاک داں
پھر بھی گردش میں ہے اک نہیں دو جہاں
تُو بتاتا ہے سب کو ـــــ مجھے بھی بتا
چھتریاں سات رنگی لیے پھرے رہے ہیں سبھی
دھوپ میں
سب کے سائے گھنے
میرا سایہ فقط میں ہی ہوں ـــــ کیا کروں؟
سائباں تو فقط مرحلہ ہیں، توقف ہیں لمحوں کا پھر کیا؟
دیکھ کتنے یگوں سے میں گھوما ہوں
تاروں پہ، تلوار سے تیز دھاروں پہ
شیروں کی گہری کچھاروں میں
بُو ہے جہاں آدمی کی نہ آدم کی بُو
تُو بتا ـــــ؟
کیا وہیں پہ نہیں ہوں جہاں سے چلا ـــــ
آ مرے ظرف پر تھرمامیٹر لگا
کتنے درجے حرارت ہے اس لمحۂ فکر میں
تُو بتاتا ہے سب کو ـــــ بتا؟

(نعمان فاروق کے لیے)

تمہیں خزاں کی خبر نہیں ہے؟

جو سر اٹھانے سے قبل پامال ہو گئے ہو
تو مڑ کے دیکھو!
تمہارے بوڑھے شجر اکھڑ کر ہمارے قدموں میں آ گرے تھے
(انہیں زماں کی شہی ملی تھی)
یہ تالیوں کی صداؤں میں گم
جو فاختاؤں سے مل گئے ہو
سخن شناسی کے زُعم میں تم
خرد کی حد سے نکل گئے ہو
خرد ہمارے گھروں میں اُتری
ہمیں تھے وہ جو دریچے کھولے
فراستوں کی ہوائے تازہ کی دلبری کو کھڑے ہوئے تھے
جو اس سے پہلے
اور اس سے پہلے کی داستاں میں لکھا ہوا ہے
وہ بھول جاؤ/کہ صبح ہم سے ہے شام ہم سے
ورود ہم سے جمود ہم سے رہی بہاروں کا شاخسانہ
اور اب خزاں کے بھی دیوتا ہم
سوز سری میں پنپتے پودو!
مجال کیا ہے؟
تمہیں تو گروی رکھا گیا ہے

☆☆☆

رات کی اسیری

نیند لیٹی ہے ہمارے ساتھ پر یہ غیر ہے
سانس چلتی ہے مگر یہ سانس بھی اپنی نہیں
جسم جلتا ہے تو ہے یہ جسم کی اپنی خطا
کپکپاتے ہونٹ ہیں تو ہونٹ کی اپنی سزا
دل مچلتا ہے تو دل کو اِک ٹھکانہ چاہیے
چاہیے نا! چاہیے کوئی بہانہ چاہیے
ہم کہ ہجرت اوڑھ کر اک خواہشِ تکمیل میں نکلے
کہ رستے پاؤں میں آ کر پڑے

شام چلتی ہے تو پھر یہ شام رکتی ہی نہیں
آس اُگتی ہے تو پھر یہ پیڑ بن جاتی ہے یارا
رات آئے جو میسر، بیٹھ جا
گر نہ آئے تو مسلسل ہجر ہے

صبح کب ہوتی ہے گر یہ رات کا بسمل نہ ہو
کاٹنی ہے رات تو پھر رات کو سینے میں بو
ہم کہ آنکھوں میں کھٹکتی شاہ کالی کے اسیر
ہم مسافت کو پروں میں باندھنے والے فقیر
رات، ہجرت، ہجر سب ہیں بس گماں کی اک لکیر

(ڈاکٹر ابرار احمد کے لیے)

CamScanner

تسلّی کی گرد میں لپٹی لایعنیت

چلو بازو اُٹھاؤ پھر سے گنتے ہیں
کہ کتنے کام آئے اور کتنے اب بھی باقی ہیں
چلو بازو اٹھاؤ آسماں سے
تھیلیاں خوراک کی اُتریں
کھجوریں تو بہت ہی دور کے ساحل پہ اُگتی ہیں
وہاں کی ریت پر خیمے لگانے کیلئے ویزے نہیں ملتے
ہمیں جلدی بہت ہے
پُشت پر تاریخ لادو
اور اندھیرے غار میں چھپ کر
کسی مکڑی کو عرضی پھر سے لکھو
جال بُن جائے
(مچانوں میں کمانیں کب تلک کاندھوں پہ رہتی ہیں)
کلاشنکوف جب سے ٹوٹ بکھری ہے
اسی دن سے درندے دندناتے پھر رہے ہیں
راج کرتے ہیں
چلو ہم ورد کرتے ہیں
ہرے ملبوس والے جلد اتریں
اور ایٹم بم کو ہاتھوں میں مسل ڈالیں

☆☆☆

الیاس بابر اعوان

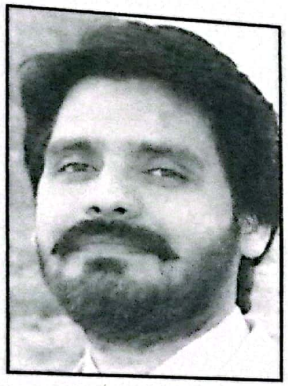

نام: محمد الیاس اعوان
قلمی نام: الیاس بابر اعوان
ای میل: micropoet@gmail.com
فون نمبر: 0321-5104648

تصانیف: خوابِ دِگر (غزلیہ مجموعہ) 2012
نو وارِد (نظمیں) 2016

ہمارے دن گزر گئے

گھروں میں کوئی پیڑ ہے نہ موتیے کی بیل ہے
نہ دال کو بھگارتی ہوئی جوان لڑکیاں
کہ سب چلن بدل گیا
فراغتوں کے دن گئے
گئیں وہ کُنجِ وقت کی سفید ریش ساعتیں
شجر کی راہداریاں اُجڑ گئیں
گھنی دوپہر میں
کُھلی کُھلی سی دھوپ کا سفر بھی رُک گیا
گلی کے سُرخ موڑ پر
کنارِ شام نقرئی لباس میں
جمالتی ہوئی شریر اپسرا نہیں رہی
وہ رِیش میں گندھے ہوئے
بدن کا خم زمین پر اتارتے ہوئے
ضعیف لاٹھیوں پہ ڈولتے
خمیدہ سر نہیں رہے
وہ ٹائروں سے کھیلتا غبار اڑاتا بچپنا
وہ سانولے حجاب میں سفید مسکراہٹیں
حیا کی سبز کترنیں
کہ جن پہ سُرخ موتیوں کا نیلگوں لحاف تھا
نجانے کون سمت ہیں

جلے بجھے سے دیپ ہیں نظر کی رہگزار میں
ذرا ذرا سی روشنی کہ جس میں خام عجلتیں
بدن کے داغ سینچتیں
جھکے جھکے مزاج پر تنی تنی سی الجھنیں
دلیل سے ورا ہے ساری گفتگو کا سانحہ
ذرا ذرا سی زندگی، بڑا بڑا سا خوف ہے
لبوں کے سرخ بام پر ملالِ رفتگاں نہیں
فراستوں کا قحط ہے
ملامتوں کا عہد ہے
ہمیں فریبِ زندگی، ذرا سا کام کیا پڑا
ہمارے دن گزر گئے

یہ کارگاہِ خام ہیں

ذرا یہ رقص روکیے
سرائے ماہتاب میں فقط یہ چاندنی نہیں
ذرا اسے بھی دیکھیے
حقیر فیل بان کا سیاہ رنگ سا بدن
قریب میں پڑا ہوا
لباس سے ورا مگر حیا سے ماورا نہیں
نہ اس کا کوئی نقش ہے نہ اس کے کوئی نین ہیں
بس ایک لہر سانس کی ہے نغمہ ہائے مشترک
یہ گرمیِ خرام بھی عجیب لطف خیز ہے
قدم رکے تو سنگ ہیں
تھرک اٹھے تو خاک ہیں
کہاں کے جسم کس سے فروغِ انہدام ہوں
کسے خبر؟
نہ رنگ ان کا روشنی
نہ رقص ان کی گفتگو
ہمیشگی کی سِل پہ نقش لفظ کے غلام ہیں
تمام انہدام ہیں
ازل سے رقص گاہ میں نظر کا التزام ہیں
یہ کارگاہِ خام ہیں

☆☆☆

رقاصہ

ہجومِ تازہ صف آرا ہے انتظار میں ہے
اُس ایک شعلہ بکف آئنہ مزاج کا جو
طلوع ہوتا ہے پردے کے اُس طرف شب کو
تو سب بصارتیں روشن چراغ ہوتی ہیں
پلک پلک پہ تھرکتا ہے اُس پری کا وجود
ہر ایک تال پہ کھلتا ہے اُس کی سانس کا خم
جہاں جہاں پہ پڑیں اُس کی ایڑیوں کے بھنور
وہاں سے تارِ تنفس بہ التزام کھلے
تمام مجمعِ انفاس دم بخود سرِ رقص
وہ جسم جیسے کہ محوِ کلام ساز و سرور
وہ آنکھ لوگوں کی آنکھوں کے التفات میں گم
وہ صرف ناچتی ہے اور وقت دیکھتا ہے
یہ شرق و غرب میں فتنے کی بازیابی کا دور
ذرا سی دیر میں تارِ فسوں بنا ہوگا
غروب ہوتا ہے اک رقص، سب کے قلبِ حزیں
طلوع ہوتے ہیں دائم غروب ہونے کو

☆☆☆

CS CamScanner

کیٹ واک

ہوا کے زرد پھریرے پہ اپسراؤں کا نور
وہ ذوقِ ترکِ حجابات میں گندھی آنکھیں
خرابہ ہائے ریاضت سے لرزاں بار قدم
تلاشِ صندل و سیمیں بدن میں گُرگِ فساد
سجے سجائے ، تنے ، ایستادہ ، رنگ نژاد
یہاں پہ جسم برائے فروخت ہوں جیسے
اِسی جہانِ نظر میں ، میں حسنِ خواب انگیز
جو عکسِ آب پہ کچھ اس طرح سے چلتا ہے
کہ جیسے رقص پہ مائل کسی چراغ کی لو
ثباتِ مشقِ ستم دُور تک ہُمکتا ہوا
میں حرفِ دامنِ صد چاک ، نا تمام کلام
کسی کے لمسِ ساعت سے آشنا ہو کر
شعورِ دید کے تلخاب واہموں کے دروں
بس ایک پل کی تجلّی کو آشکار ہوا
پھر اس کے بعد ہجومِ خرامِ صحبتِ نو
طلوعِ جلوۂ تازہ پہ مسکرائے گا
رہے گا ساتھ مرے تالیوں کا شور ذرا
پھر ایک عمر کی خاموشی ہمرکاب مری
یہی ہے حسنِ نظارا کی دائمی ترکیب

☆☆☆

اذیت کے پھندے

سنو اہلِ صحرا!
شمالاً جنوباً یہ رقصاں بگولے
جنہیں اذنِ تیشہ گری مل گیا ہے
تمہارے سروں پر مخجل ساعتوں کی
نئی داستانوں کو کندہ کریں گے
صنوبر کی لکڑی کے تابوت لے کر
سمندر کے اُس پار سے سرخ وحشی چلے آ رہے ہیں
تم اپنی زمیں کے وہ تنہا مسافر
جنہیں راستوں کی خبر تک نہیں ہے
جنہیں چار جانب سے گھیرا گیا ہے
درختوں کی دستار چھینی گئی ہے
چھتوں کی ردائیں جلا دی گئی ہیں
نواحِ محبّت میں سوداگرانِ معیشت کی منڈی
جہاں خون بکتا ہے اپنوں کے ہاتھوں
پنپنے لگی ہے
سنو اہلِ صحرا!
تمہیں یہ اذیت عطا کی گئی ہے
سو جھیلو عقیدت سمجھ کر اسے تم
اسی میں تمہاری بقا رہ گئی ہے

☆☆☆

CS CamScanner

اعتراف

وہ ہجر یافتہ لمحے وہ کم نگاہ شہود
مری نظر کے حوالوں میں تھے کبھی موجود
کہیں کہیں کوئی کترن خیالِ رفتہ کی
کہیں کہیں کسی رعنائی کی لپک عریاں
مرے وجود میں کھلتا ہوا وہ تارِ طلسم
وہ میری سانس میں ٹھہرا ہوا عذابِ نہاں
وہ سمت جیسے ہو بجھتے چراغ کی ساعت
درونِ وہم و گماں چشمِ نیم شب کا سکوت
یہیں فلک کے کواڑوں کا نور نتھرا ہوا
یہیں پروں پہ مرے چادریں سفارت کار
کہاں کہاں کا ہُنر بولتا ہوا دل میں
فقط رہینِ طلسماتِ جاوداں مری صوت
یہ آئنوں سے ہُنر کیش لذتوں کے وجود
یہ ٹمٹماتی ہوئی ان کہی ہوئی باتیں
ریاضتوں میں ہمکتے ہوئے وہ خال و خط
وہ تُربتوں پہ کھلے پھول کچھ کتابت کے
وہ میرے خواب جنہیں لوگ اشک کہتے ہیں
مرے قلم کی صداقت میں بس یہی کچھ ہے

☆☆☆

صبح

یہ برگِ خواب، یہ گملوں میں پچھلی رات کے دُکھ
کیے ہوئے ہیں مقفّل سراب عہد کے پھول
جلی ہوئی کسی تصویر کا بجھا ہوا رنگ
جھڑی ہوئی ہیں دیارِ فسوں کی دیواریں
جھکی ہوئی ہیں چھتیں سبز فام بستی کی
درِ نوا ہے مقفّل کہ مصلحت اندیش
زمانے برسرِ پیکار ہو گئے ہم سے
شجر کہ جیسے برہنہ پرستشوں کے سُخن
کلام کرتے ہوئے موسمِ گرفتہ سے
میں ضعفِ سانس کی نسبت سے ہوں گریزاں اور
دو نیم آگ پہ تشکیلِ خد و خالِ جنوں
قدم قدم پہ ہے زنجیر، آب و گل کا ہنر
عجیب خوف سماوات سے اُتر آیا
ندی کی سطحِ خموشاں پہ رقصِ سوز و حروف
سماعتوں میں تکلّف کِھلا صداؤں کا
مرے چہار طرف جبرِ بے نیام ہُوا
میں ایسی صبح کی دہلیز پر کھڑا ہوا ہوں

☆☆☆

التجا

پردۂ خاک پہ روندے ہوئے گلزار کو دیکھ
سبز کر سرد تعلق پہ جڑے نقش کی لو
خوش مزاجوں کی روایت کا بھرم رہ جائے
ہم پرندوں کی مناجات پسِ پشت نہ ڈال
تیری آسودہ نگاہی کی طلب ہے پھر سے
دور تر پھیلے ہوئے سبز کناروں کے بدن
جن سے اکتائے ہوئے پل کی مہک آتی ہے
تیرے اک لمس کی حیرت سے نئے ہو جائیں
زرد شاخوں پہ تنی قوس کی تاویل نہ ڈھونڈ
سوچ مت کیسے خطاوار ہُوا موسمِ گُل
آ کہ اب زرد روایت پہ اُتر آئیں گلاب
سانس روکے ہوئے منظر کی فراوانی میں
ہجر کے تازہ تعلق پہ نظر ثانی کر
ہم جو آزاد ہوئے ہیں ہمیں زندانی کر

☆☆☆

گفتگو

ہمارے درمیاں ہزار لفظ آ گئے
تو یک بہ یک ٹھہر گیا
سماعت و کلام کا یہ سلسلہ
چہار سمت خامشی ٹھہر گئی
اِسے نہ موت جانیے
یہ خامشی!
یہ خامشی تو گفتگو کا ربط ہے

☆☆☆

ہائپر ریئلیٹی

وحشتِ خواب کے پامال دریچوں سے پرے
ایک نوزائدہ بے نام حوالوں کا ہجوم
رونقِ گریۂ ہنگام ہُوا چاہتا ہے
کیا خبر سرخ بگولوں کے تروتازہ بدن
کس سے ترکہ ہنگام میں ڈھل جاتے ہیں
ساحرہ! چھیڑ کوئی کذب میں ڈوبا ہُوا راگ
سطوتِ شاہ گریزاں ہے تو رہ جانے دے
بے بصر! گامِ تسلسل میں کہیں دُور بہت
گردِ لاحاصلی، آشفتہ سری، ناموری
بس کہ ہے فصلِ تمنا کے لہو ہونے کا نام
ابر پاروں کی جبینوں پہ مضافات کا دُکھ
جھلملاتا ہے تو تلوار بدستوں کی ہنسی
کاغذی نطق کے الہام میں دب جاتی ہے
سُرخ ہوتے ہوئے چہروں پہ اُتر آتا ہے
سبزۂ رونقِ دربار کا پہلا موسم
ساحرہ! قصۂ زر بخت سناتے ہوئے لوگ
کیسے شوریدہ عناصر کی نوا بنتے ہیں!
چاک پر آبلہ پائی کی مسافت کے میاں
صرف انساں نہیں بنتے ہیں خدا بنتے ہیں

☆☆☆

پروین طاہر

نام: پروین اختر
قلمی نام: پروین طاہر
فون نمبر: 0321-5185285
تصنیف: تنکے کا باطن (شاعری)

دُکھ کا پیش لفظ

نیم اندھیری تنہائی اور
کروٹ کروٹ بے چینی سے
آنسو آنسو بیتے دکھ میں
کشف آور وہ ساعت آن ملی تھی
کبھی کبھی جو چھب دکھلائے
سائیں سائیں ہوکتی
مگھر رات اماوس میں
یا پھر چیت کی کن من کن من
وحی اُترتی بارش میں
ویرانی سے باتیں کرتے
سندر ریشم پیڑوں میں
شام شفق کی لالی میں اور
گھُلتے رات اندھیروں میں
کشف آور وہ ساعت
لفظوں اور نظموں سے باہر
چتر کلا کی بولتی قوسوں
اور رنگوں سے باہر
گرین وچ کے اندازوں
اور پیمانوں سے باہر
ساری خوشیوں اور دُکھوں سے باہر۔۔۔

☆☆☆

موڑیں کیسے مہار!

پروا پھرے اُڑاتی خوشبو
اَزلی مہکے کِھلیانوں سے
اور خوشبو کی لہروں سے
لپٹا اِک سندیس الوہی

آپاؤں ترے دھلواؤں
دور سے آئے،
خاک میں لتھڑے سجل سنیہے
کئی زمانے چھوڑ کے پیچھے
اُڑتے اُڑتے تھک گئے ہوں گے
کاہے اِتنی جان گنوائی
پیش رفت کی عادت تو
اپنی نسوں میں دَوڑ رہی ہے
موڑیں کیسے مہار
اُن کھیتوں کھلیانوں کو
جن سے پُروا ہر دم خُوشبو
اور سندیس چُراتی ہے
قریہ قریہ پھریہ پاگل
سنگی ڈُھونڈنے جاتی ہے!

☆☆☆

صدر دروازے پر منتظر

جانے کس کی لَو کا پرتَو
پَل پَل جَلتی بجھتی آنکھیں
جانے کس کی مَدھ ماتی مُسکان کا حیلہ
ڈانواں ڈول لرزتی ہستی
اِک بے اَنت سا عالَم ہے
اِک پیہم سی گردِش ہے
اِک اَندھا سا ہالہ ہے
اور ہالے میں گم صُم رُوحیں
آگاہی کا بھاری پتھر
سر پہ اُٹھائے،
عدَم آگاہی کے محلوں کے
دَر کھلنے کی آشا باندھے
صدیوں سے لائن میں لگی ہیں
پہلے کس کی مُکتی ہوگی!

☆☆☆

گھات

کچھ نہ تھا جب منکشف تو
پھوٹ کر نکلی تھی
شدھ کلیان کی ہر تان سے
تب زندگی
نیلگوں، نرمل، سُبک رَو
بھاگتی، رقصاں، بلا آواز
قدموں پر اچھلتی زندگی
ایک مقدس راگنی تھی
''جل ترنگ'' سی بج رہی تھی
اَور وُ و تبدیل ہوتے
منظروں سے بے خبر
شام کی اُودی لَپٹ میں
سج رہی تھی!

چند لمحوں ہی میں
سُر منڈل پہ ایسی گھات تھی
راگنی ایمن
ملن کی شانتی کی راگنی
باگیشری میں ڈھل گئی!!

☆☆☆

تِنکے کا باطن

گیلی لکڑی کے گٹھوں پر
جو پھینکے اِنگار
اُس کو کیسے درشن ہوگا
آگ، الاؤ اَور دھوئیں کا
اور بُھوبل کی سب سے نچلی
تہ کے اندر
وہ جو دو پَل کا جیون ہے
تیز ہَوا کی زد پر آ کر
اِک پَل میں مٹ جاتا ہے!

جس کا آگ، دھوئیں اور
شعلوں جیسے منظر بھاتے ہیں
اُس کو لکڑی سے باطن سے
تنکے تک بھی جانا ہوگا!!

☆☆☆

تیسری بھاؤنا

پاری جت اِور سُورج مکھی
اک جذبے کے نام ہیں دونوں
پر اظہار نے سورگ اَور دھرتی
کی دُوری پر رکھا ہے
میں بھی اِسی قبیل کی
تیسری بھاؤنا ہوں!

سورگ اِور دھرتی میں حائل ہے
گھور توقع اَور رضا کی حدِ فاصِل
مجھ کو کیا اَپنانا ہے
پاری جَت سی گھور توقع
یا پھر سُورج مکھ اَیسا ظرفِ اعلیٰ
مَیں خواہش کا تیجا رُوپ---
تیجی راہ نکالوں
لاحاصِل کے رنگوں
ناممکن کی حِدّت سے
اَپنا سُورج ڈھالوں!!

☆☆☆

کیا گماں حضر بھی ہوسکتا ہے!

کشتیاں راکھ ہُوئیں
اُنگلیاں آدھ جلے
عزم کے ٹکڑے ڈھونڈیں
سامنے پھیلا ہے صحرائی بگولوں کا غُبار
اَور عقب میں ہے سمندر کی ہنسی!

سُن ذرشہرِ گمان
ہم تو مدہوشِ تخیّل
تَری گلیوں کے گزرگاہوں کے
تجھ کو سر کرنے کی
پانے کی مُعطّر خواہش
آنکھ کے آگے
کوئی جال بُنے رکھتی تھی
کان بھی ٹھیک طرح سُن نہ سکے
خوف سے بدکی ہوئی
تیز ہَوا کی ہلچل
جال کے پار فقط ایک جھلک دِکھلا کر
یہ ہمیں کون سے ساحل پہ اُتارا تُو نے!!

☆☆☆

جتن

تُو بس ایک بہانا ہے
میں تو اپنا عکس ہی دیکھنا چاہوں
تیری آنکھ کی پتلی میں
اپنے حُسن کا کھوج لگاؤں
تیرے لفظوں، شبدوں میں
من اندھیاروں جوت جگاؤں
تیرے نینوں کے اڑتے چنگاروں سے
اور ٹھنڈا سیت ڈراوا سینکوں
تیرے لمس کے انگاروں سے
جیلے لاکھ کروں جینے کے
آخر کار تو
تنہا رہنا پڑتا ہے!

☆☆☆

آخری سمت میں بچھی بساط

ہمیں ہر کھیل میں ہر بات پر
اے مات کے خواہاں
کبھی کھینچیں گے ہم باگیں
جنونی سر پھری اندھی ہواؤں کی
اُڑائیں گے فلک پر
چاند تاروں سے بنے رتھ کو
پھر آئیں گے تجھے ہم راہ کرنے
سُرمئی دُھندلے جزیروں سے
سنہری آس رنگی سرزمیں تک
نئے مہروں سے پھر اپنا
پرانا کھیل کھیلیں گے
تری ہر مات کی ہر چال کو
شہ مات دیکھیں گے

☆☆☆

تابش کمال

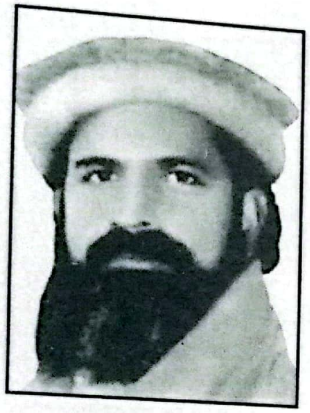

نام: تابش کمال

فون نمبر: 0300-5144878

تصانیف: منظر منظر دھوپ
شام پئی بن شام
مہاجر پرندوں کی نظمیں
صلِ علیٰ

رات، سورج اور گُم نظم

شبِ بے ماہ میں آوارہ ستاروں کی جلن
دل کسکتا ہے
مگر نظم نہیں بن پاتی
اتنا بے مہر فسوں ہے
کہ یہ سناٹا بھی رگِ جاں کاٹتا ہے
یہ ہیولے ہیں کہ آسیب ہیں
ان پیڑوں کے
جن کی شاخوں کی طراوت میں لہو بڑھتا تھا

ان پُراسرار گزرگاہوں سے
آج اگر ثابت و سالم گزروں
کل کا خورشید مری راہ میں حائل ہوگا
شب کا حاصل ہے سلگتا ہوا، تپتا ہوا دن

اپنے آئندہ کی تمہید بندھے
کوئی امید بندھے ابر بھرے دن کی،
سیہ رات میں مہتاب کے لہرانے کی
بے نمو آئنۂ چشم میں کچھ نقش بنیں
(کوئی مکمل نہ سہی)
ہاتھ اگر ہیں تو شباہت بھی ابھر آئے گی

نا امیدی میں نہ جی پاؤں گا
کوئی ریلا کہ یہ رستے میں کھڑی
سنگ کی دیوار ہٹے
لفظ محرومِ معانی نہ رہے
نظم مکمل ہو جائے

☆☆☆

شاعروں کا جبر

چائے کی بھاپ میں
گھلتے ، معدوم ہوتے ہوئے قہقہے شام کا بانکپن
کوئی مصرع دھوئیں کے بگولوں میں کمپوز ہوتا ہُوا
کوئی نکتہ جو اسرار کے گُھپ اندھیرے سے شعلہ صفت سر اُٹھائے
عجب دھیما دھیما نشہ اختلافات کا
اپنے نچلے سُروں میں کوئی فکر مربوط کرتا ہُوا زاویہ
طنز کے ناوکِ خوش سلیقہ کی سَن سَن
ہواؤں سے محفوظ سانسوں میں آراستہ مختلف سگرٹوں کی مہک
شام کے سُرمئی بانکپن میں
کسی کوٹ ، مفلر، سویٹر سے اٹھتی ہوئی خوشبوئے آشنا
جوڑتی ہے ہمیں اک سمے سے جو مدّت سے
اک ناملائم زمانے میں محکوم ہے
کون لمحے کو واپس بلائے ، سمے کو مکمّل کرے
اپنی نظمیں اسی اک تسلسل زدہ دائرے میں ہیں
پرکار جن کی رہائی پہ مائل نہیں
ریستورانوں کے کونوں میں سہمی ہوئی
کتنی شاموں کا جادو یہاں سطر در سطر محبوس ہے
ہم جو قیدِ زمان و مکاں سے نکلنے کو پَر مارتے ہیں
بھلا شام ڈھلنے پہ الفاظ کے پنچھیوں کو جکڑتے ہیں کیوں
دامِ تصویر میں /یہ بگولے ، دھواں ، بھاپ اسیری کے عادی نہیں
شام خود رات کی گود میں جا کے ،گرنے کو بے تاب ہے

بے گھری

خواب کی سلطنت سے ادھر
اک جہاں ہے جسے آنکھ آباد کر لے تو کر لے
وہاں سائے ہی سائے ہیں
اکثر و بیشتر دھوپ میں رقص کرتے ہوئے
ریزگاری کی آواز پر دھڑکنیں تال دیتی ہیں تو جھلملاتے ہیں
آنکھوں میں خواب
(اپنا گھر اس کے دارالخلافے میں ہے)
صبح سے شام تک
نوٹ گنتی ہوئی انگلیاں یوں تھرکتی ہیں
جیسے تمناؤں کو تھپکیاں دے شبِ ہجر میں ایک برہن کا دل
روز خوابوں کی پونجی میں سِکّوں کے گرنے سے اک گونج اٹھتی ہے
گویا کہیں ٹین کی چھت پہ بارش کے قطرے پڑیں
روز اک گھر تمنا کے ملبے سے آنکھوں کے پاتال میں جھانکتا ہے
وہی بے گھری ، بے زمینی کا دکھ آج تک مجھ کو گھیرے ہوئے ہے
میں چانداور سورج کی صورت فلک در فلک تیرتا ہوں
مِرے خواب مجھ کو اُڑائے لیے جا رہے ہیں
میں پامال ہوتی ہوئی آرزو میں کہاں تک جیوں گا

☆☆☆

ہَوا سے کہہ دو

وہ سبز بیلیں جو سرو در سرو دوڑتی تھیں
وہ تتلیاں جو گلاب اندر گلاب رقصاں تھیں
اب نہیں ہیں
صبا تو کب کی نکل گئی ہے
پرند، پنچھی نئے دیاروں کو جا چکے ہیں
درخت گھٹ گھٹ کے مر رہے ہیں
وہ بانسری کی حسین لے خواب ہو گئی ہے
جگہ جگہ مُردہ آرزوؤں کی ہڈّیاں ہیں
ہوا سے کہہ دو کہ آئے اور مملکت سنبھالے
ہوا کا ماحول بن چکا ہے

☆☆☆

اپنی سالگرہ پر

گئے برسوں کا حاصل کیا!
فقط اک موم بتّی تین سو پینسٹھ دنوں میں
کیک کے زینے پہ چڑھتی ہے
ذرا سی پھونک پر ہمراہیوں کے ساتھ بجھتی ہے
دھواں چکرا کے روشن دان سے باہر نکلتا ہے
چھری کی دھار سے کتنے برس کاٹوں!
ہوا کا آشنا چہرہ مری آنکھوں میں رہتا ہے
گئے لمحوں کو دہراتی ہوا طرزِ محبّت ہے
وہ آئے تو نئے لمحوں کی رسّی تھام کر چل دوں
کہیں اندر رُکی پھونکیں لبوں تک آئیں
تو یہ بتیاں گُل ہوں
ابھی کل کے دریچے کُھل نہیں پائے
مناظر دھند میں ہیں
آنسوؤں سے دُھل نہیں پائے

☆☆☆

سونامی

.....اور اب تو خشک و تر کے درمیاں کھینچی لکیریں بھی نہیں

پانی ہی منصف ہے

کوئی ساحل نہیں

ہر سمت بس موجیں ہی موجیں ہیں

ہمارے ہاتھ نے دھرتی پہ جو حرفِ غلط لکھا،

جو فصلِ کینہ ہم نے بوئی تھی

سب لے گیا پانی

یہ سطحِ آب پر بہتے ہوئے لاشے ہمارے وہ تصور ہیں

جنہیں انسان سے انسان کی دوری نے جنما تھا

سخی لہروں نے جسموں سے وہ سارا زہر چوسا،

سُرخ دھرتی پر بچھا ڈالا

کئی صدیوں سے فاقہ کاٹتے گدھ اور کوّے خوش!

اگر اب پھر کوئی دیوار انسانوں میں اُٹھی،

زندگی نے سرحدیں کھینچیں

تو کوئی بھی نہیں ہوگا جو کہہ پائے

فقط پانی ہی منصف ہے

☆☆☆

قصۂ شب

سُرخ آنکھیں گھماتے ہوئے بھیڑیے رات کا حسن ہیں

سرسراتے ہوئے شاخچوں میں چھپے ماندہ پنچھی،

مُصلّے پہ بیٹھے ہوئے ریش دار اہلِ باطن،

پنگھوڑے میں کلکارتے نور چہرے،

یہ بستر بدلتی ہوئی لڑکیاں،

زہر اُگلتے ہوئے سانپ،

دیوار پر جست کرتے ہوئے سائے،

لڑتی ہوئی پتلیاں، رات کا حُسن ہیں

اپنے سر پر یہ صدیوں سے پھیلا ہوا بے مہ و نجم گردوں

سرِ شام رنگ اپنا تبدیل کرتا ہے تو رات کا آئنہ جاگتا ہے

اندھیروں بھرے آئنے میں صدائیں ہیں، صورت نہیں

سامعہ شکل ترتیب دیتا ہے

سنتے ہوئے جگمگاتے ہیں آواز کے خال و خد

میں نے سرگوشیوں، قہقہوں، منتروں، آہٹوں

اور آہوں میں دیکھا ہے حُسن

ایک پیرائے میں سر اُٹھاتی ہیں غُرّاہٹیں،

وصل آثار سانسیں

یہ پلکیں جو آہستہ آہستہ ڈھلنے لگی ہیں

شفق جو اندھیرے میں گھلنے لگی ہے

یہی رات کا حُسن ہے

رات آنکھوں میں ہے

خوں بہا کون دے

کہاں جائے مصرعوں میں اُلجھا ہُوا دل!
ہر اِک سمت اعداد کا شور ہے
لال، نیلے، ہرے کاغذوں کی کھڑاکھڑ میں الجھے ہوئے کان،
جھنکارتر سی ہوئی سبز آنکھیں،
بٹن پر ٹکی لالچی اُنگلیاں،
کچھ بھی میرا نہیں
کوئی میرا نہیں

چمچماتی ہوئی گاڑیوں کے گزرنے سے اُٹھتی ہوئی گرد کا ذائقہ
کیسے مصرعے کی گُل قند کو راستہ دے
کھڑاکھڑ کی لو بھی رُتوں میں بھلا کون مصرع سُنے
رات کی آخری ساعتوں میں
لہو میں مچلتا یہ آہنگ ہونٹوں تک آئے تو کیسے
اِسے بہری بستی میں گویائی کا خوں بہا کون دے گا!

☆☆☆

کہاں آ گئی ہو

چند سال اس طرف
ہم شناسا نگاہوں سے بچتے بچاتے
یہیں پر ملے تھے
تمہیں یاد ہے
کائنات ایک ٹیبل کے چاروں طرف گھومتی تھی
ہمیں دیکھ کر کتنے بوڑھوں کی آنکھیں
کسی یادِ رفتہ میں نم ہو رہی تھیں
مگر میں نے آنکھوں میں
اپنے لیے اور تمہارے لیے
مچھلیوں کی طرح تیرتے آنسوؤں میں تمنائیں دیکھیں
مجھے یاد ہے
جب کسی اجنبی مہرباں نے ہمیں پھول بھیجے
تو تم کتنی نروس ہوئیں
جلد ہی خوف، خدشے ہوا ہو گئے
دوسری ٹیبلوں پر بھی گلدستے ہنسنے لگے
اب محبت کا مسکن کہیں اور ہے
یہ جگہ اب زباں بند دشمن کا منہ کھولنے کے لیے ہے
جہاں اپنی ٹیبل تھی اب اس جگہ ایک پھندا لگا ہے
کہاں آ گئی ہو محبت کا کتبہ اٹھائے ہوئے
آؤ آگے چلیں

خلیق الرحمان

نام: خلیق الرحمان

ای میل: khaleeqpoet100@gmail.com

فون نمبر: 0331-5663212

تصنیف: کنول جھیل کا گیت

دامن کوہ میں شام

کوئی رستہ نہیں

عجب اِک دُھول اُڑتی ہے
دمکتے، لہلہاتے کھیت اب کچھ بھی نہیں کہتے
سسکتے پنگھٹوں پر چیختی ہے آرزومندی
ہواسُونے بنوں میں آشنا چہرے ترستی ہے

کبھی سرسوں میں ہم کِلکارتے جگنو پکڑتے تھے
کوئی لڑکی چُنریا میں گلاب اور بیر بھرتی تھی
وہ کھیلیں خواب کے شمشان میں پَل پَل سلگتی ہیں
کوئی جھونکا چُنریا کی گلابی باس اس جانب نہیں لاتا
مجھے اب کوئی بھی منظر نہیں بھاتا

وہ بہتی ندّیاں اب گرد ہیں
ان کے کناروں پر اُگے کانٹے لہو میں رقص کرتے ہیں
عجب اِک دھول اُڑتی ہے
کوئی رستہ نہیں ملتا
کبھی اس شوخ لڑکی نے جو پودوں میں چھپایا تھا
وہ اِک بستہ نہیں ملتا

☆☆☆

دستک!

بہت پرانی باتوں کے پیلے پتّے یوں گرتے ہیں
جیسے قدموں کی آہٹ گیلی مٹی میں سوتی ہے
جیسے آگ میں جل کر لکڑی راکھ کے ڈھیر میں ہوتی ہے
لاکھوں میل کی دُوری ہو یا ایک ہی شہر میں بستے ہوں
سات سمندر حائل ہوں یا دو گلیوں کے رستے ہوں
دُنیا داری کرتے کرتے روتے ہوں یا ہنستے ہوں
اِن باتوں کی دستک دل کے دَر پر اکثر ہوتی ہے
اس دستک کے پیچھے گزرتے وقت کی دیوی ہوتی ہے

☆☆☆

دُھند چھٹنے کے بعد ایک روشن دن!

جاڑے کی ان دو پہروں میں
کتنے دن سے پھیلی تھی جو دُھند چھٹی ہے
تیز چمکتی دُھوپ کا شیشہ نکھر گیا ہے
رہداری کا فرش بھی اب تو سُوکھ چلا ہے
آڑو کی ٹہنی پر چڑیا پنکھ اُٹھا کر پُھدک رہی ہے
پاس روش میں اِک گیندے کا پھول کِھلا ہے
دُور سے ماں کو دیکھ کے بچّہ ہاتھ کو اپنے چُوم رہا ہے!

☆☆☆

تم دیوار بناتے کیوں ہو؟

اپنی خوشیوں کے رَستے میں
اپنے خوابوں کے بستے میں
دُکھ کا ایندھن خود ہی بھر کر
چنگاری دِکھلاتے کیوں ہو
جس میں اِک دن جل جانا ہو
ایسی آگ جلاتے کیوں ہو؟
اُمیدوں اور خوابوں والے
اَپنے ہر رستے کے آگے
دُکھ ہمزاد بٹھاتے کیوں ہو؟
جن میں دَر ہو نہ کوئی کھڑکی
اُن کمروں میں جاتے کیوں ہو؟
تم دیوار بناتے کیوں ہو؟

☆☆☆

ایٹمی جزیرے میں تتلیوں کے خواب!

ایٹموں کی بستی میں
خوف کے جزیرے میں
اِک نگر تمہارا ہے اِک نگر ہمارا ہے
پانیوں کی سرحد پر سُوکھتی زمینوں پر
پھول جو نہیں کھِلتے
لوگ جو نہیں ملتے
فاصلے کدورت کے نفرتوں کے پیراہن
دُکھ کے ایسے گھاؤ ہیں
دو گھڑی کی ڈھارس کے خوش گمان دھاگوں سے
جو سدا نہیں سلتے / چار دن کے جیون میں
زندگی مسرت کا عارضی کنارا ہے
دُور کی مسافت کے ایک جیسے رَستے پر
ساتھ ساتھ چلنے میں کس قدر سہارا ہے
جگنوؤں کی شمعوں میں تتلیوں کے رنگوں میں
ایٹموں کی بستی میں خوف کے جزیرے میں
سانجھ اور سویرے میں
چار دن کے جیون میں
نفرتوں کے ساگر پر
فاصلے کدورت سب کلفتیں بُھلاتے ہیں
زندگی کو ساحل پر آؤ ملنے جاتے ہیں!!

دھیان قبر میں اُترتا خیال!

میرا رستہ قبرستان سے ہو کر آگے جاتا ہے
اس رستے سے اور بھی لوگ گزر کر آگے جاتے ہیں
لیکن میرے ساتھ ہی آخر سائے سے کیوں رہتے ہیں
میرے من میں آخر کیسی ویرانی قبروں کی ہے؟
رات کی خاموشی میں جھینگر کی ہیں کیسی آوازیں؟
کچھ دن سے مٹی کی خوشبو
کیوں چبھی ہے سانسوں سے؟
مرے پاؤں خاک سے لگ کر کس کا ماتم سنتے ہیں؟
میرا دیواروں کے اندر دَم کیوں گھُٹنے لگتا ہے؟
میرے سر پر بوجھ ہے کیوں کتبوں پر لکھے حرفوں کا؟
مجھ اگر کی خوشبو کیوں آتی ہے اپنے اندر سے؟
کیوں میری آنکھوں میں کڑوے تیل کا دِیپ سا جلتا ہے؟
میرا سینہ پھولوں سے کیوں بوجھل ہونے لگتا ہے؟
کیوں اس رَستے پر چلتے مَیں خود سے پوچھنے لگتا ہوں؟
میں قبروں کے اندر ہوں
یا قبریں میرے اندر ہیں؟

☆☆☆

کون ہے؟

کون ہے جو لفظوں کے گہرے بھید کی گرہیں کھول سکا ہے
رات کے زینے پر بیٹھی صدیوں کی صبحیں دیکھ سکا ہے
آنسو کے قطرے کب کوئی دُکھ جھیلوں میں ڈھونڈ سکا ہے؟
پانی کی لہروں پر مٹتے نقش کوئی کب روک سکا ہے
چُپ کی ازلی رات کے اندر لفظ کوئی کب بول سکا ہے
کون ہے جو سانسوں میں اُلجھا جیون گنجھل کھول سکا ہے؟

☆☆☆

یہ لوگ ہم تو نہیں ہیں دیکھو؟

ہمارے دل بھی کٹھور دل ہیں
جو پتھروں کی گپھا کے اندر پڑے ہوئے ہیں
یہ کیسی دیوار ہے کہ جس میں شگاف اب تک نہیں پڑا ہے
ہمیشگی کی سلوں کے نیچے
وہی ازل کی نمیدہ رنجش
وہی پرانی رقابتوں کے شریر پھندے
دلوں کی گرہوں میں پڑ گئے ہیں
یہ لوگ ہم تو نہیں ہیں دیکھو جو مرنے والوں کو رَو رہے ہیں؟
یہ کون شکووں کی روغنی مٹیوں کے پُتلے بنا رہا ہے
خود اپنے جیون کے گڈی کاغذ کے آنگنوں پر
دراڑ ہوتے دُکھوں کے ملبے بنا بنا کے گرا رہا ہے!

☆☆☆

گدلا پانی پینے والے!

کب دیکھے ہیں؟
تم نے میلی جھونپڑیوں میں بسنے والے
جن کے بچے گدلا پانی پیتے پیتے مَر جاتے ہیں
کب دیکھے ہیں؟
اُونچے محلوں کے روشن دانوں سے تم نے
کوڑے کے ڈھیروں میں پلتے
مکھی مچھر
جو بیماری کے آنگن میں پیدا ہو کر
بھوک کے زہریلے ''سپرے'' میں خاموشی سے مَر جاتے ہیں
جیون کے یہ کچے دھبے
دُکھ بارش کی چھینٹوں میں کب مٹ جاتے ہیں؟
تم کیا جانو.....!
کچی بدبودار گلی کے
کس آنگن کے..... کس کونے میں؟
کب یہ جرثوموں سے انساں
پیدا ہو کر مَر جاتے ہیں!

☆☆☆

کبھی روشنی میری رفتار ہوگی؟

نجانے مَیں کب بے کراں آسمانوں کی
بے انتہا وسعتوں سے ملوں گا
زمین و زماں کی حدوں سے نکل کر
کسی آسماں کی طرف کب بڑھوں گا؟
ستاروں سے میری شناسائی کی کوئی تجدید ہوگی؟
کبھی جال میں میرے آکاش گنگا گرفتار ہوگی؟
ستاروں کی مٹی مرے پاؤں کی خاک بن کر اُڑے گی؟
بھٹکتے ستاروں کی آکاش منزل کبھی میری ہوگی؟
کبھی روشنی میری رفتار ہوگی؟

☆☆☆

خدا تاخیر کردیتا!

نہیں تھا میری قسمت میں کہ مَیں سب دیکھ سکتا وہ
جو آئندہ زمانوں کے مناظر میں وقوع ہو گا
کہ جب یہ فاصلے محدود سے محدود تر ہوں گے
فقط دو چار قدموں پر یہ سارے بحر و بر ہوں گے
جو انساں کے ہدف کا ہے نشانہ دیکھ لیتا مَیں
مری قسمت میں کب تھا وہ زمانہ دیکھ لیتا مَیں
خدا کرتا تو آتے وقت میں تحریر کر دیتا!
مجھے دُنیا میں لانے میں ذرا تاخیر کر دیتا!

☆☆☆

دانیال طریر (مرحوم)

نام: دانیال مسعود
قلمی نام: دانیال طریر
تصنیف: آدھی آتما
معنی فانی
خواب کم خواب
خدا میری نظم کیوں پڑھے گا
معاصر تھیوری اور تعینِ قدر
جدیدیت، مابعد جدیدیت اور غالب
بلوچستانی شعریات کی تلاش

میرا کمرہ کبھی مندر بھی تو بن سکتا ہے

رات بھر رات گئے تک شاید
کالے موسم کی ہوا دستکیں دیتی رہی دروازے پر
اور میں کمرے کے اک کونے میں بیٹھا خاموش
اُنگلیوں پر مری حیرانی کے دن گنتا رہا
گنتی جو ختم نہیں ہوتی تھی
آنکھیں کنڈی پہ جمائے ہوئے اس سوچ میں گم
دستِ نادیدہ اگر کھول گیا بابِ طلسم
جسم میں دوڑتا یہ خون ٹھہر جائے گا
آنکھ کی روشنی کالک میں بدل جائے گی
خوف کی دھند میں ڈھل جائے گی جنموں کی
ریاضت میری

میں وہیں بیٹھا ہوا کونے میں
سوکھ جاؤں گا کسی بت کی طرح
پھر کوئی داسی چرن چھونے چلی آئے گی

☆☆☆

شب گزیدہ

رات کا پہلا طلسم
جسم میں جلتی ہوئی سانسوں کی آگ
دوسرا
خاموشیوں میں پھونکتے پھنکارتے زہریلے ناگ
تیسرا
وہ راگ جس پر رقص کرتے ہیں ستارے
جن میں لکھا ہے زمیں والوں کا بھاگ
اور اک ہم
جو ستارے توڑ بھی سکتے نہیں ہیں
شب میں جینا چھوڑ بھی سکتے نہیں ہیں

☆☆☆

قالوا بلیٰ

فلک کو دیکھتا ہوں
دھنک کے رنگوں اور اڑتی پتنگوں میں سفر
آساں نہیں ہے

کہ ان کے رنگ پکے
اور مرے پر دودھ میں بھیگے ہوئے ہیں
مجھے اپنے پروں کو داغ لگنے سے بچانا ہے
کہیں دھندلاہٹوں کی سمت جانا ہے
مگر جب تک گھنے بادل
زمیں سے آسماں تک چھا نہیں جاتے
میں پر پھیلا نہیں سکتا
وہاں تک جا نہیں سکتا

کہ آگے راہ میں پانی نہیں
اور مجھے یہ حکم ہے
بے داغ لوٹوں

☆☆☆

نظم بازی کے گُر

جو آنکھوں کے اندر ابلتا رہا ہے
جو دل پہ دھواں بن کے چلتا رہا ہے
جو سوچوں میں چہرے بدلتا رہا ہے
میں اب سب لکھوں گا
دلوں میں ہمارے کدورت ہے کتنی
محبّت پری خوب صورت ہے کتنی
بدن کو بدن کی ضرورت ہے کتنی
میں اب سب لکھوں گا
کہاں سے کہاں تک ہے امکاں کی وسعت
مکاں لا مکاں کے سوالوں کی حیرت
زماں لا زماں میں ہے کیا سر وحدت
میں اب سب لکھوں گا
جہاں ہندسوں کے ترانے میں گم ہے
ہوا جشن وحشت منانے میں گم ہے
یہ سب کیوں اجالا مٹانے میں گم ہے
میں اب سب لکھوں گا
یہ زر کے پجاری کہاں جا رہے ہیں
زمیں کے ذخائر کو ہتھیا رہے ہیں
تو کیا خود کو دولت میں دفنا رہے ہیں
میں اب سب لکھوں گا
خدا کیوں کہانی سے باہر کھڑا ہے
یہ کیا ہو رہا یہ وہ کیا سوچتا ہے
وہ کیا چاہتا ہے یہ کیا ماجرا ہے
میں اب سب لکھوں گا
بہت دن سے تو یاد آئی نہیں ہے
کوئی رات رو کر بتائی نہیں ہے
تو کیا یہ جدائی، جدائی نہیں ہے
میں اب سب لکھوں گا

مجھے نظم لکھنے کا فن آ گیا ہے

برائے فروخت

روح چاہیے تم کو
یا بدن خریدو گے
موت سب سے سستی ہے

سامنے کی شیلفوں میں
رنگ رنگ آنکھیں ہیں
ساتھ نیند رکھی ہے
خواب اس طرف کو ہیں

سب سے آخری صف میں
حسن کی کتابیں ہیں
خیر کے فسانے ہیں

فرسٹ فلور پر سائنس
میگزین فیشن کے
اور علم دولت ہے
آج کی ضرورت ہے
سب سے بیش قیمت ہے

فرش پر جو رکھا ہے
دین ہے تصوف ہے
فلسفہ ہے منطق ہے
باعث تپ دق ہے

ڈسک کاؤنٹر کے پاس
شیش داں میں رکھی ہے
جیسے قیمتی چیزیں
آسماں میں رکھی ہیں

آسمان والا بھی
کیا یہاں پہ ملتا ہے
کیسے بھاؤ بکتا ہے

پہلے خوب چلتا تھا
لوگ لینے آتے تھے
اب خدا نہیں بکتا

جانے کس زمانے سے
اس زماں میں آئے ہو
یہ جہاں نہیں صاحب
تم دکاں میں آئے ہو

☆☆☆

لفظ ازم

لفظ جڑتے نہیں
کوئی مصرع بناتے نہیں
بوجھ اٹھاتے نہیں
مجھ سے کہتے ہیں
ہم کوئی مزدور ہیں
گٹھڑیاں
کترنوں سے بھری گٹھڑیاں
کیوں اٹھاتے پھریں
کوئی مجبور ہیں
ہم سے کس نے کہا ہے
کہ ہم بار ڈھونڈے پہ مامور ہیں
خواب اوروں کے سارے
پہ شانے ہمارے
بہت خوب
جاؤ کسی اور کو ڈھونڈ لاؤ
جو معنی کی بجری بھری یہ تغاری
اُٹھا بھی سکے
سر جھکا بھی سکے
جا تلاشو انہیں
وہ جو احساس کی ریت کی بوریوں کے لیے

ریڑھ کی ہڈیوں کو کماں کر سکیں
کارلا حاصل بے تکاں کر سکیں
ہم بہت تھک چکے
اور تنگ آ گئے
اپنے شانوں پہ خوابوں کے زنگ آ گئے
ہڈیوں میں بھی معنی کے رنگ آ گئے
زنگ بھی اتنا گہرا کہ کٹتا نہیں
رنگ بھی ایسے پکے کہ اڑتے نہیں
ہاتھ جوڑے مگر
لفظ جڑتے نہیں

☆☆☆

نظم گو کے لیے مشورہ

نظم کہو گے
کہہ لو گے کیا؟
دیکھو اتنا سہل نہیں ہے
بنتی بات بگڑ جاتی ہے
اکثر نظم اکڑ جاتی ہے
چلتے چلتے
''لا'' کو مرکز مان کے
گھومنے لگ جاتی ہے

لڑتے لڑتے
لفظوں کے ہاتھوں کو
چومنے لگ جاتی ہے

سیدھے رستے پہ مڑتی ہے
موڑ پہ سیدھا چل پڑتی ہے

حرف کو برف بنا دیتی ہے
برف میں آگ لگا دیتی ہے

چپ کا قفل لگا کر گونگی ہو جاتی ہے
دھیما دھیما بولتے یکدم غراتی ہے

نظم کہو گے
کہہ لو گے کیا؟
دیکھو اتنا سہل نہیں ہے
بنتی بات بگڑ جاتی ہے
راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے

☆☆☆

اک اور اندھا کباڑی

خواب اٹھائے کیا پھرتے ہو
خواب کے گاہک کب آئیں گے
خواب کباڑ ہیں سخت پہاڑ ہیں
خواب اٹھائے کیا پھرتے ہو
کیوں پھرتے ہو
تم جو مانہ دیکھ رہے ہو
یہ بازار ضرور ہے لیکن
اس کا نظم وطور جدا ہے
اس کا اپنا دین، پیمبر اور خدا ہے
یہاں پہ کاروبار جمانا چاہتے ہو تو عورت بیچو
عورت سب سے مہنگے داموں میں بکتی ہے
وہ جس چیز کو چھو لیتی ہے اس کو سونا کر دیتی ہے
اس کی چھون کو ڈھال بناؤ
جتنا چاہے مال بناؤ
صابن بیچنا ہو تو اس کے گال دکھاؤ
شیمپو بیچنا ہو تو اس کے بال دکھاؤ
روحوں کی بدبو کو گھٹانے والی
تن مہکانے والی
خوشبو بیچنی ہو تو اس کا جسم دکھاؤ
اس کے سارے طلسم دکھاؤ
سوئمنگ پول میں اس کے برہنہ جسم پہ پانی کی
لرزش کرتی بوندوں کی جھلمل کو ہتھیار بناؤ

ایک اور دو کے چار بناؤ
عورت لے لو
شاپنگ مال میں یہ آواز لگا کر دیکھو
کتے، سؤر، گدھ اور کاگے
سب آئیں گے اڑتے بھاگے
دانت چباتے رال گراتے
گھٹنوں تک جیبیں لٹکاتے
کوئی پیچھے کوئی آگے
چھوری گوری کسی کی چاہت
کسی کی خواہش عمر میں چھوٹی
تکہ تکہ بوٹی بوٹی
مانگیں گے سارے بازاری
مت لے جاؤ دل کی بھٹی
خواب بریدہ
خاک میں لتھڑے
اعضا ٹیڑھے، صورت بھدی
چھوڑو یہ سب ردی ودی
عورت لے لو
شاپنگ مال میں یہ آواز لگا کر دیکھو
اس کے نازک ماس کے گاہک سب آئیں گے
خواب اٹھائے کیا پھرتے ہو
خواب کے گاہک کب آئیں گے

تمنا کا دوسرا قدم

وقت اور ناوقت کے مابین
کتنا فاصلہ
کتنا خلا
کتنی گھنیری خامشی ہے
جاننے کی کوششوں میں
آنکھ کی اور دل کی اجلی آنکھ کی
بینائیاں کم پڑ گئی ہیں
سوچتا ہوں
سوچ کا کوئی پرندہ بھیج کر اس حد لا حد کا
کوئی اندازہ کر لوں
خود سے کہتا ہوں
تجھے معلوم ہے
یہ کام سوچوں کے پرندوں کا نہیں
تخیل کا ہے
جو پرندہ غیب کی اس جھیل کا ہے
جس میں سب نادیدگاں کے
عکس بنتے رقص کرتے ہیں
انھی نادیدہ گاں میں
وقت اور ناوقت کے مابین کا
وہ فاصلہ اور وہ خلا اور وہ گھنیری خامشی
بھی ہو تو کیا معلوم
بہتے عکس ان کے طائر تخیل کے شہپرے سے
لپٹے ساتھ آ جائیں
یہ گہرے بھید میرے ہاتھ آ جائیں

☆☆☆

داؤد رضوان (مرحوم)

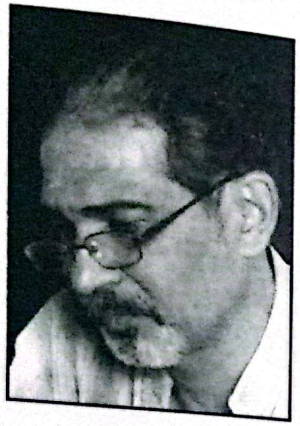

نام: داؤد رضوان

قلمی نام: داؤد رضوان

تصنیف: سناٹا بولتا ہے (نظمیں)

شامہ نامہ

رات سونگھتی جائے

جاگتی صداؤں کو
بھاگتی ہواؤں کو
راستوں کی وحشت کو
منظروں کی حیرت کو

رات سونگھتی جائے

چاند کو ، گھٹاؤں کو
خوف کو ، بلاؤں کو
جھیل کے کناروں کو
سب کے سب ستاروں کو

رات سونگھتی جائے

بے لباس سایوں کو
اپنوں کو ، پرایوں کو
بستروں کو ، جسموں کو
روح کے طلسموں کو

رات سونگھتی جائے

کاغذوں کو ، لفظوں کو
روشنی کی نظموں کو
شیلف کی کتابوں کو
شاعروں کے خوابوں کو

رات سونگھتی جائے
رات سونگھ لے جس کو
تیرگی میں کھو جائے
گہری نیند سو جائے
آپ رات ہو جائے

رُوح میں رقصاں گیت

مری ذات میں
تری دلکشی سے جو رنگ ہیں
انھیں کیا لکھوں
کہ کوئی دھنک سی
مرے افق پہ بکھر گئی
(مرے بادلوں کو مگر زمین ملی نہیں)

میں کوئی بگولہ
ہوا کے دوش ٹکا ہوا
مرے حوصلے کی اُڑان میں
مرے بازوؤں کے حصار میں
کوئی آسمان بھی تو نہیں

مرے پانیوں کے اچھال میں
یہ جو رقص ہے
مری موج موج کے اضطراب میں تیرتا
یہ جو عکس ہے
یہ ترے جمال کی بات ہے
ترا ماہتاب سا نقش ہے

☆☆☆

شہرِ اندیشہ میں محبّت کی ایک کہانی

کئی انجان رشتے تھے
جنھیں تکمیل کی خواہش میں
جڑتے ٹوٹتے
کتنے عذابوں کے جہنم سے گزرنا تھا

کسی معدوم سی آواز کے جگنو
ہزاروں نور سالوں کی رفاقت کو جنم دیتے
مگر پل بھر کی روشن آس
شب کے کینوس پر
ہجر کی تصویر رنگتی ہے
گماں کے پانیوں میں
خواب کے کتنے جزیرے ہیں
جو ڈوبے تو کبھی اُبھرے نہیں ہیں

بدن کے کاغذوں پر درد کی بارش
فقط بوسیدہ گی لکھتی رہی
لیکن دعا کے سبز حرفوں کی رسائی
آسماں کے نیل دھوکے تک کہاں ممکن۔۔۔!

☆☆☆

بجھی یادوں کی راکھ اوڑھے ہوئے
تیرا مرا چہرہ
تعلق کے کسی عنوان کی تشریح تھا
اک داستاں کے بعد کی
اک داستاں تھا

ناممکن کا ممکن

شام دل گرفتہ ہے
بے وجود تنہائی
چار سمت پھیلی ہے
دھند کی ردا اوڑھے
خواب اگلے وقتوں کے
سرخ بوجھل آنکھوں میں
لہر لہر اُمڈتے ہیں
بوند بوند تاویلیں
خواہشات کا ایندھن
سرد کر نہیں سکتیں

☆☆☆

خواب کے بے سکون لمحے

بڑی مُدّتوں سے
فقط ایک منظر حریفِ نظر ہے
سکوتِ زمانہ کا عالم مسلسل۔۔۔
اور اک وحشتِ دل
کہ جس کے خیالِ عبث سے رگیں ٹوٹتی ہیں

جمودِ تمنا سے ہستی کے اندر
کوئی منتشر سوچ پیہم دراڑیں بناتی چلی جا رہی ہے
(رگوں میں لہو کی دھمالیں
خیالوں میں اُڑتے بگولے)
مگر کوئی سپنا
خیالِ جمالِ محبت سے آراستہ
چشم کے خواب داں میں
ابھی تک تو۔۔۔اترا نہیں ہے

☆☆☆

ایک نظم کسی کے لیے بھی نہیں

یہ داستاں عجیب داستان ہے
کہانیاں وقوع سے تہی
وجود لاوجود ہوتے سارے سلسلے
کراں سے تا کراں
شکستہ آرزوؤں کی بگڑتی بنتی صورتیں

ہوائیں رُخ بدلتی
ریگزاروں پر رقم
پیام پڑھتی ہنستیں
اک خرامِ ناز سے
نقوش سارے اور زاویوں سے آشکار کرتی ہیں
رواں دواں تمام قافلے
نئے تعینات میں بھٹکنے لگتے ہیں

یہ داستاں عجیب داستان ہے
جبینِ وقت پر
شکن۔۔۔شکن
گئے حوالے درج ہیں
مگر کتابِ وقت کے ورق کی
اجنبی زباں سے آشنائی تک
ہوائے شوخ و شنگ بھید بھاؤ اپنے
اور انگ سے بتانے لگتی ہے

مرتّبینِ وقت
الجھے زاویوں، نئی نرت میں
راستہ بھٹک کے دور جا نکلتے ہیں
مکاں سے لامکاں تک
زماں سے لازماں تک
نئی کہانیاں وقوع پاتی ہیں
(مگر برائے شوق حیرتوں کے باب بند ہیں)
سوال کے قدیم سلسلے
جواب کی طلب میں
آنکھ کے نمک سے
دل کے زخم کا مداوا کرتے ہیں

☆☆☆

بے خوابی میں ایک کیفیت

زندگی بے مزہ حقیقت ہے
کوئی میٹھا نہ کوئی کڑوا پن

خواب ہیں یا شہابِ ثاقب ہیں
ایک پل کو بھڑک کے بجھتے ہوئے
راکھ بن کر بکھرتے جاتے ہیں

ایک روشن لکیر آنکھوں میں
دیر تک عکس بن کے بہتی ہے

کوئی افسردگی سی سایہ بنی
ذات کے ساتھ ساتھ چلتی ہے

☆☆☆

رازدان

روشن دان میں بیٹھی چڑیا
بستر کی اک اک سلوٹ گنتی ہے
اور دور کہیں جا کر روتی ہے

☆☆☆

بارہ برس بعد بھی

کہنے سننے کی ساری
باتیں ختم ہوئیں
کن من کن من گرتی بارش
دور کہیں تن کی مٹی میں
خواہش کا نم بوتی ہے

گیان کے لمحے میں
درد کی پروا چلتی ہے
پورب، پچھّم
اتر، دکھن
ایک بگولہ
گھمن گھیری کھاتا
بھیتر کے تھل میں
ریگ اُڑاتا ہے
خون کے اندر
ایک اکیلا موسم تنہائی کا
جنم جنم سے
کنڈلی مارے بیٹھا ہے

آنگن آنگن
سرما کے پورے چاند کی شیتل کرنیں
اور اشکوں اشکوں
ایک وشال سمندر یادوں کا

بستی بستی ایک تڑپ کوکتی جائے
سوچوں سوچوں ایک کتھا بھولتی جائے
پھر بھی شیام نہ آئے
پھر بھی شیام نہ آئے

☆☆☆

بے ثمر یادوں کی رفاقت

کہاں کے دکھ تھے، کہاں پہ رونا پڑا ہمیں
دائمی محبت کی آرزو میں
یوں ریزہ ریزہ بکھر گئے ہیں
کہ جیسے پتے خزاں کی رُت میں
ہوا کے قدموں تلے
ارادے بھی سارے بھلا چکے ہیں

کسی کی باتوں میں بھیگتی چاندنی کے پر مضحل ہوئے ہیں
اُداس لمحے بکھرتی راتوں کی اوس میں
آنکھ میں جڑے ہیں

نگہ جو یادوں کے پیچھے نکلی
پلٹ کے آئی نہیں ابھی تک

☆☆☆

وہ شامِ وصل نہیں تھی

بے آباد جزیروں میں
کچھ پھول کھلائے تھے
اور ہوا کے رُخ پر
خوشبو کی ناؤ اُتاری تھی
بے چہرہ پانی پر نقش اجالے تھے
اور تجھے یاد کیا تھا
وقت کی قبر میں
زینہ زینہ اُترتے لمحوں میں
سارے وعدوں کا پاس رکھا تھا
ایک ہجومِ بے مہر کے بیچ
کٹھن رستہ کاٹ کے جو
لوٹا ہوں تو دیکھتا ہوں
رت کے گلابی چہرے پر
وقت کی سرسوں پکنے لگی ہے

☆☆☆

رفعت اقبال

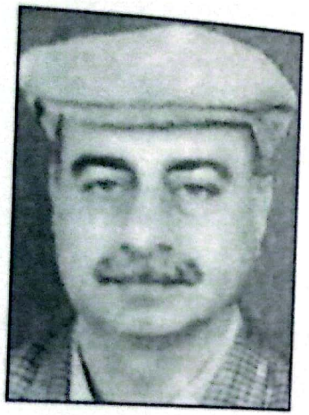

نام: رفعت اقبال خان
قلمی نام: رفعت اقبال
ای میل: drriffatiqbal@gmail.com
فون نمبر: 0331-9773727
تصنیف: خرد افروزی اور روشن خیالی

ابھی معصوم ہیں سورج کی سب کرنیں

شہر کی ویراں گلیوں، خالی سڑکوں پر سناٹا
کالی چادر اوڑھے پھرتا ہے تو
اس کے قدموں کی آوازیں
اپنے کمرے کی کھڑکی سے مجھے سنائی دیتی ہیں
تب لکھنے کی ٹوٹی کرسی سے اُٹھ کر میں
اس کھلی ہوئی چوبی کھڑکی تک آجاتا ہوں
قلم اُٹھائے سناٹے کو چلتے دیکھتا رہتا ہوں
جو رفتہ رفتہ خوابوں سے خالی آنکھوں میں بھر جاتا ہے
یوں ہی رات گزر جاتی ہے
صبح سویرے رکالی، سخت سڑک پہ اپنے بستے تھامے ننھے بچے
باتیں کرتے، ہنستے گاتے
شہر کے اس اسکول کی جانب جاتے ہیں
جس کے فرشوں پر
بھورے، میلے اور نم خوردہ، پھٹے پرانے ٹاٹ بچھے ہیں
جس کی دیواروں پر سبز، گھنیری کائی کے انبار جمے ہیں
جب سورج کی کرنیں بن کر ان بچوں کی پیاری نظریں
میرے چہرے پر پڑتی ہیں
کالا، گاڑھا سناٹا آنکھوں میں
خوابوں کی تابش میں ڈھل جاتا ہے

☆☆☆

آوازِ سگاں

دلوں کو چیرتی
مکروہ
آوازِ سگاں
آتی، لپکتی، وار کرتی ہے
ہری نیندوں کی وادی میں
گھنیرے شاخساروں پر
کئی نادید خوابوں کے شگوفوں کو
ذرا کھلنے نہیں دیتی
خیابانِ تمنا منتظر
کب نکہتِ گُل کی پری اُترے
محبّت کے مہِ لرزاں کی اُجلی ضو میں

دھیرے سے
کنارِ چشم آئے
جھانک کر دیکھے
تو ظلمت کی عفونت میں بُسا
شہرِ عداوت بھی معطّر ہو
منوّر ہو

☆☆☆

بہادر بچے

کچرے کے ڈھیروں سے
ردّی کاغذ، دھاتی ٹکڑوں،
پھٹے پُرانے شاپنگ بیگوں کی صورت میں
روزی چُنتے پیارے بچے
تاروں جیسی آنکھوں، چندا چہروں والے
یہ وہ ننھے شہزادے ہیں
ٹوٹے چپّل پہن کے نازک پیٹھوں پر
اگلی نسلوں کا بوجھ اٹھائے
سرما کی صبحوں میں
روشن سورج کی اُنگلی کو تھامے
ٹُٹ پاتھوں اور کچی آبادی سے اُٹھ کر
اونچے محلوں کے دامن میں آجاتے ہیں
کچھ بچے ایسے بھی ہیں جو
اپنی قسمت کی کالک سے
اُجلے لوگوں کے جوتوں کو یوں چمکاتے ہیں
جیسے وہ ان کے خوابوں کے چہرے ہوں
یہ وہ بانکے شہزادے ہیں
جنگوں کے عفریت نے جن سے
دھرتی کی پتھریلی مسند
اور زُمرّد قالینوں کو چھین لیا ہے
محنت کی بھٹّی میں تپ کر کندن ہونے والے
سارے پیارے بچے
کتنے اچھے، کتنے اونچے ہیں
اُن موٹے، توند بھرے، دریوزہ گر سلطانوں سے
جو دستاریں کشکول بنا کر
منّت و گریہ کے عادی ہیں
دھرتی کو ماں بھی کہتے ہیں
لیکن اپنے عیش کی خاطر
آقایانِ مغرب کے خلوت خانوں میں
دھرتی ماں کو بیچ آتے ہیں

☆☆☆

دوستی مجھے تنہائی سے پہچانتی ہے

دوستی
صبح کی نرمیلی اوٹ سے جھانکتی خوشی ہے
دن کو چنچل کرنیں آنکھوں میں سجائے ہم قدم ہوتی ہے
شام کی آہٹوں سے پہلے ہنس کر
دور جاتی آوازوں کے الوداعی ہاتھ ہلاتی ہے
اچانک شب کے دریچوں میں آن چمکتی ہے
اے محبت کے سورج کی تابانی
ہم نے خواب زار کے سنگی بنچوں پر بیٹھ کر
چند ہی تو حرف سیکھے تھے
ست رنگی دھیان کے نروان لمحوں میں
دوستی کا اتم شبد
کائنات کے یک رنگ ہالے کے اندر
گونجتا ہے
وقت کی دھڑکن بنتا ہے

☆☆☆

لاپتہ بیٹوں کی ماؤں کے نام

کٹھن، بے کیف، پھیکے دن کے سائے
ڈھلنے لگتے ہیں
تو بوڑھی ماں
ہرے آنگن کے کونے میں
مُصلے کو بچھاتی ہے
ثنا کے بعد زیرِ لب
دعا کا وِرد کرتی ہے
مرے چھوٹے سے کچے گھر کے دروازے پر آ کے
راہ تکتی ہے
پُرانی، ملگجی چادر کے پلّو سے
وہ اپنی خواب سے محروم آنکھوں کی نمی کو صاف کرتی ہے
گلی کے موڑ سے آتے ہوئے سائے کو تکتی ہے
مگر وہ میں نہیں ہوتا

☆☆☆

نئے سال کے لیے ایک نظم

رات کی اس خامشی میں

روشنی کا زرد چہرہ

مضمحل

سرد کمرے کی خنک دیوار پر

سائے لرزتے

خواب سے

ذہن میں بے رحم سوچوں کا ہجوم

زندگی کا سر بریدہ جسم ہے ریزہ بہ ریزہ منقسم

سالِ نو

روتا ہوا بچہ جسے

پیدا کیا ہے زندگی نے

پیشِ مرگ

☆☆☆

مہاجن

سلسلہ ان بے اماں سانسوں کا

باقی تو رہے

کچھ دیر

بازارِ جہاں کی رونقیں چمکیں

تواتر ٹوٹ جائے فاقہ مستی کا

زرِ محنت کے بھاؤ تاؤ میں اُلجھے ہوئے تاجر

معاش اور احتیاجاتِ فراواں کے یہ ہنگامے

اداکاری کی زحمت میں پڑے مُردے

خود اپنے دوش پر الزام رکھے خلقتِ بے حال و فردا

مضمحل، مجبور فریادی

حقیقت کی گرانی سے خمیدہ پشت

اِستادہ تو ہوں اک بار

دیکھیں سر اٹھا کر آسماں کو

ڈھل سکیں، چمکیں سبھی بجھتی ہوئی آنکھیں

طلوعِ خوابِ تابانی کی امکانی محبّت میں

سُن اے سفاک سوداگر

تری ہستی، تری فُرصت کی سب مصروفیت کا سحر ہم سے ہے

ہمیں کچھ دیر زندہ رکھ

☆☆☆

CS CamScanner

ٹھیک ہی کہتے ہو

ہم نے بھی جب ہوش سنبھالا
ساحل ساحل
تیر اندازوں کو چلّوں پر تیر چڑھائے دیکھا
کتنی بوندیں پیاس تھی اپنی
تم نے پھر بھی تیر چلائے
تپتی ریت پہ کتنے سینے چاک ہوئے ہیں
کوئی نہیں ہے

بہتا دریا
جو تم سے آزاد کرائے
جتنی سانسیں تھیں
سب دھرتی کے بیٹوں نے گروی رکھ دیں
قدرت کے کھیتوں میں ہم نے
سرخ لہو کو امرت کر کے
سبز رسیلی فصلیں سینچیں
اپنی پوروں کو زخمایا
تلواروں اور بندوقوں کے بل بوتے پر
تم نے جیون دان بٹورا
کوہِ صعوبت کے پتھریلے سینے سے
ہم کھود کے لائے نہرِ شیریں
پھر بھی سارے باغ بغیچے، گُل، اثمار تمھارے

دھرتی پر جو کچھ ہے تمھارا
ماٹی کے بیٹوں کا حق ہی کیا ہے
کیسی مرضی
تم دھنوان ہو، تم بلوان ہو
تم سچے ہو، تم نردوشی

☆☆☆

تمہارے سینے میں دل کہاں ہے

تمہارے سینے میں دل رہا ہے
تو اس پہ دستِ فگار رکھو

ذرا بتاؤ
سیاہ، گہرے، طویل غاروں میں
تجربہ کب سے ہو رہا تھا
گزشتہ برسوں سے
زُود افزوں مہیب عفریت کو
جواں، گرم خوں کی خوراک چاہیے تھی
ہمارے بچوں، سجیلے خوابوں کا خوں جواں ہے
کہاں ہیں عاجل مفاد زادے
انہیں بھی لاؤ
(نہ منہ چھپاؤ)
بھلا یہ کس نے کہا تھا
''عفریت اور درندوں میں
فرق ہوتا نہیں ہے اتنا
یہ اک اشارے پہ سر جھکائے گا
اور جھکائے رکھے گا
جب تک وہ چاہتے ہیں''
انہیں یہ زعمِ ہنر ہمیشہ سے تھا
''ہم ایسے دلاوروں کو
درندگی کو غلام کرنے کا فن ودیعت کیا گیا ہے
سو ہم درندوں سے کھیلتے ہیں
مہیب عفریت پالتے ہیں''
تمہی بتاؤ
یہ باؤلا کھیل آگ، بارود اور لہو کا
شروع کرنے سے پہلے کس نے یہ بات سوچی
چہار سمتوں میں پھیلنے کو
بلا بڑھے گی
تمام آنکھوں، سبھی کے خوابوں، دلوں کو
اپنے نُکیلے پنجوں سے نوچ لے گی
جوان، گاڑھے لہو کی خوراک کم پڑے گی
ذرا ٹٹولو، ہمیں بتاؤ
تمہارے سینے میں دل کہاں ہے

☆☆☆

حُکمِ زماں

اک تکلّم ہے خموشی کا
حیاتِ گُزراں
میں بھی موجود ہوں
اس آئنہ خانے میں
یہاں
جیسے گرفتارِ گماں
ٹوٹتے بنتے، بکھرتے ہر سُو
عکس در عکس ہیں
بے انت جہاں
طِفلکِ خندہ لباں
مست، مگن
پیر و جواں
قریہ ابرو ہوا
غنچہ و گل بدَناں
حُسنِ مکاں
میں بھی موجود یہاں
ذات کے نقطے میں ہوں گُم
رقص کُناں
حُکم کرے نطقِ زماں
نطقِ زماں

صوت و سماعت سے ورا
جیسے زمیں تا بہ زمیں
اور خلا تا بہ خلا
غائب و موجود خدا

روش ندیم

نام: محمد ندیم اسلم

قلمی نام: روش ندیم

ای میل: ravishnadim@gmail.com

فون نمبر: 0300-9505159

تصانیف: ٹشو پیپر پہ لکھی نظمیں

دہشت کے موسم میں لکھی گئی نظمیں

جدید ادبی تحریکوں کا زوال

منٹو کی عورتیں

فیض احمد فیض (فیض صدی: منتخب مضامین)

ابر کی آہٹ

تیسری دنیا کا فلسفۂ انکار

پاکستان برطانوی غلامی سے امریکی غلامی تک

اَن کہی آیات کی تلاوت

یہی انساں!
مری تنہائیوں میں رینگتی اکتاہٹوں
ازلوں سے پھیلی فرصتوں کی
بے خیالی کا تماشا ہے
ابھی کل تک تو یہ پھونچال اور طغیانیوں کو
میرا غصہ جان کر
کیسے لرزتا، گڑگڑاتا، معبدوں میں سر جھکائے
میری اک نظرِ عنایت کا بھکاری تھا
مگر دیکھو!
کہ کیسا، فارمولے ایٹمی بم کے، کلوننگ کے
یہ اپنی جیب میں رکھے،
خدا بن کر کھڑا اِترائے جاتا ہے
اور اپنی کچھ کتب کے زعم میں آکر
بڑے انداز سے
میرے صحیفوں کی ورق گردانیاں کر کر کے
ہنستا اور ہنساتا ہے
سمجھتا ہے کہ میں اس بے کراں عالم میں
اِک بے کار پُرزہ ہوں
کہ جو ازلوں سے بس عرشِ معلیٰ پر
فرشتوں کے جلو میں
گاؤ تکیوں سے لگا کر ٹیک بیٹھا اونگھتا رہتا ہے
پرادنیٰ مشینوں اور کتابوں کے نشے میں
جھومتا انسان کیا جائے؟
فقط دو چار دم میں یہ بڑا عالم کھڑا کرنا
ستاروں، کہکشاؤں کو ہمیشہ کے لیے
ان کے مداروں پر گھمانا
اور پہاڑوں، ساگروں اور آندھیوں کو
ہاتھ میں رکھنا
پھر اس بے مثل پیچیدہ نظامت کی نگہبانی
..... بڑا مشکل، بڑا مشکل عمل ہے یہ!
ابھی ابلیسِ نافران کا قصہ
یہی کل کی کہانی ہے!!
سو ازلوں سے بس اک لحظہ بھی
میں تو سو نہیں پایا
ٹکے بھر کا یہ انساں کیا سمجھتا ہے!
خدا ہونا کوئی آسان ہوتا ہے!!

غارِ ثور سے کائنات کا نظارہ

انامِکا! سن
میں کیسے
تاریخ کے وہ سارے رجسٹروں کو ہی پھاڑ دیتا
پھر ان کے ٹکڑے
گئے زمانوں کے کوڑے دانوں میں پھینک آتا
اور اپنی مرضی سے اک نئے دودھیا ورق پر
پھر اپنا ماضی بکھیر دیتا
یہ ایسا آسان بھی نہیں تھا

سو کیا میں کرتا
کہ میں جو تاریخ کی شرارت
اس کی شوخی کا شاخسانہ
خدا کی مٹھی سے دھیرے دھیرے پھسلتی جاتی کوئی کہانی؟
کہ نامکمل سی کوئی تمثیل؟

میں اس کی عِلت ہوں یا نتیجہ؟
میں اس کا فنکار ہوں کہ فن ہوں؟
ازل سے جاری کسی ڈرامے کا کوئی ہیرو
کہ بس اضافی سا کوئی کردار

انامِکا! بات ایسی آسان بھی نہیں تھی
سو میں اٹھا
اور ہاتھ جھاڑے
ذرا سا چوگرد میں نے دیکھا
بیاض تھامی
بڑی خموشی سے اس زمان و مکاں کے
جھنجھٹ سے لوٹ آیا

☆☆☆

کنوارے شہر کی لڑکیاں

یہاں شہزادیاں
جب خواب عمروں کے دروں کو کھولنے آئیں
تو ان کے پاؤں میں تکلے چبھے
اور عمر گزری گیسوؤں میں
برف کے موسم اتر آئے
مگر اب تک خیالوں کے وہ شہزادے نہیں آئے
محل سارے کا سارا نیند میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے
لبوں کی آہٹیں
یا آنکھ میں لکھی ہوئی کچھ سسکیاں کیسے پڑھے کوئی؟
دروں پر دور سے آتے ہوؤں کے واسطے
کچھ پھول رکھے ہیں
منیروں پر کسی کی یاد کی چڑیا چہکتی ہے
مگر اے چاند کی بڑھیا!
وہ جن کو بانجھ سوچیں چاند راتوں میں ڈراتی ہیں
وہ تنہا لڑکیاں
اپنے سوالوں میں کھڑی آواز دیتی ہیں:
''سحر تو روز ڈھلتی ہے
ابھرتی ہے
مزاجِ وقت کیوں اب تک نہیں بدلا؟
ہماری منزلیں کس کے تعاقب میں گئیں
لوٹی نہیں اب تک؟
یہ سب کس کی شرارت ہے؟
ٹشو پیپر پہ تقدیریں لکھیں
اور پانیوں کی گود میں دکھ دیں''
سو کتنی لڑکیاں تنہائیوں کے دشت کی باسی
کہ جن کے ہونٹ کی نیلاہٹوں پر
رقص کرتی آرزوئیں ہیں
اب ان کے سرخ رنگے ریبنوں سے
ذات کی محرومیاں تو چھپ نہیں سکتیں
حصارِ خواب سے وہ لڑکیاں باہر نہیں آتیں
جو کچی گاگریں بھرنے گئیں تو پھر.....!
.....!!
.....؟
وہ جن کو بانجھ سوچیں چاند راتوں میں ڈراتی ہیں ..... کہانی نامکمل ہے!
چناروں کے دہانوں پر بگولے راج کرتے ہیں
دوپہریں آسمانوں کے اثر میں ہیں
سلگتے آنگنوں میں دھوپ سے مصلوب ہوتی لڑکیاں
سورج سے کہتی ہیں:
''ہمیں چھتری کوئی بھیجو
ہمیں اپنے پیا کے دیس جانا ہے''

آکاس بیل

یہ اکثر سوچتا ہوں میں.....!
یہ دنیا کیسی دنیا ہے
جہاں لوگوں کو دفتر کے جھمیلوں سے فراغت ہی نہیں ملتی
سویرے چائے میں اخبار کے کالم بھگو کر ناشتہ کرنا
پھر اس کے بعد دن بھر فائلوں پر بیٹھ کر
دریائے فردا کے نئے گمنام ساحل ڈھونڈتے رہنا
اور آخر ڈوبتے سورج کی کرنوں پر
گئے دن کی خباثت تھوک کر گھر لوٹنا
اور سوچنا:
.....ہم کون ہیں؟

☆☆☆

بابِ ازل کا پہلا ورق

(۱)
سو جب سورجوں کی کشش نے
اندھیرے خلا میں ستاروں کو بکھرا دیا
تو یہ ننھا سا عالم کسی دلنشیں دائمی راگنی پر مچلنے لگا
اور گھڑیوں کی ٹِک ٹِک پہ چلنے لگا تھا
اسی دن سے میں
ارتقا کے حسیں مرتباں میں پڑا
اپنی تخلیق کے سال گننے لگا تھا
وہ سات آسمانوں کے آخر کی منزل پہ بیٹھا
خداوندِ عالم
کسی سوچ میں غرق تھا
اور فرشتے ازل کے کیلنڈر پہ
نظریں جمائے پریشان تھے
اک جواں حور و یران فردوس میں
دودھ کی اک ندی پاس
بے چین بیٹھی ہوئی تھی

(۲)
جانے کتنے برس؟
کتنے نوری برس؟
جھومتے جھومتے یونہی رخصت ہوئے
میں درختوں کی شاخوں پہ جیون بتاتا ہوا
ایک دن آدمی بن گیا
جانے کیا ہو گیا؟
عرش کی گھنٹیاں بج اٹھیں
اس خداوندِ عالم کی نیندیں اُڑیں
اور ہراساں فرشتوں کے چہروں سے
ان کی جبینیں اڑیں
اور مرے پاؤں کے ناخنوں تک جو آئیں
امر ہو گئیں

☆☆☆

مجبوبہ کی قبر پر

تری سانسیں حسیں موسم کو تھامے دُور کی راہوں پہ جا نکلیں
مگر پھر بھی مری آنکھوں کے ساحل پر یہ لکھا ہے
کہ تو اک دن ہمیشہ کی طرح ہنستی
مہکتی شام کی پازیب چھنکاتی مرے گھر لوٹ آئے گی
مگر اس خواب کی کچی کلی جب بھی مہکنے کو ذرا تڑپی
تو سرکش آندھیاں چل دیں
سو اب تو ہی بتا مجھ کو میں ہاتھوں کی لکیروں کے سفر پر جاؤں تو کیسے؟
میں ٹھہرا عکس کا قیدی
جو سوچوں کے سیہ پردے پہ تصویریں بناتا ہے
مجھے شہروں کے جنگل سے کہاں نروان ملنا تھا
یہ تیرے خواب کے اندھے بیاباں آج میرا گیان ٹھہرے ہیں
میں کاندھوں پر ازل سے آسماں رکھے زمانوں کی تہوں میں گم
اسی پل کے دوراہے پر کھڑا آواز دیتا ہوں
کہ جس لمحے تری سانسیں حسیں موسم کو تھامے دُور کی راہوں پہ جا نکلیں
دلوں کے گنبدوں میں کوئی بھی نغمہ نہیں گونجا
نہ اندھی رات کے دَر پر کسی کی دستکیں گونجیں
میں خود پہ منکشف ہونے کو ہوں آخر
کہ میں اپنے تعاقب میں
تری یادوں کے دھندلے راستوں کا اک مسافر ہوں
سنہرے سورجوں کی ایک چنگاری کا طالب ہوں

دستاویز

حیات قرنوں کی اک شرارت
ازل سوالوں کا اک کھنڈر ہے
یہ بھید مایا کا کون کھولے؟
یہ بوڑھے بھکشو کو کیا پتہ ہے
کہ قصرِ مایا کا آہنی دَر شکستہ مندر کی چابیوں سے کھلا ہی کب ہے؟
فلک سے زہراب جب بھی برسے
تو کھیت اجڑے، بگولے اٹھے اور آندھیوں نے مہابھارت بھی روند ڈالی
(ابد کے چرخے کی کوک ٹھہری نہ دیوتا پتھروں سے نکلے)
یہ بات بھکشو نہ جان پایا
برہموں کی حویلیوں میں سویر کیوں ہے؟
(اداس داسی کا رقص ٹھہرے تو دیوتاؤں سے کوئی کہہ دے
کہ پاک ویدوں کے لفظ سارے ہی خون آلود ہو چکے ہیں
بلند محلوں کی سیڑھیاں بھی لہو سے تر ہیں)
یہ وقت دیوی کے رتھ کا چکر کہ جس کی زد میں ہزار صدیاں
مگر وہ انساں!
اسیر انتھک مسافتوں کے!!
پھسلتی ڈھلوان کے مسافر!!!
کہ جن کے کاندھوں نے وقت کی سِل اٹھا رکھی ہے
وہ بھید مایا کا جانتے ہیں؟
وہ جانتے ہیں کہ ہاتھ کن کے خموش پتھر کی مورتی کو تراشتے ہیں

افلاک گونگے ہیں

یہ خواہش کب ہماری تھی.....!
کہ ہم افلاک کے فرمان کی سُولی پہ جا لٹکیں
دُکھی جیون کی اندھی گھاٹیاں اُتریں
پھر ان بیکار سانسوں کی اسیری کا کفن اوڑھیں
یا اک دن بس یونہی بیٹھے بٹھائے
موت کی انگلی پکڑ کر مرقدوں اندر اُتر جائیں
مگر ان ساری باتوں کی وضاحت سے بہت پہلے
نیا دن دورتے اور ہانپتے سورج پہ بیٹھا
اَدھ کھلی کھڑکی کے رستے
خواب زاروں میں اترتا ہے
ہم اپنے منھ برش منہ میں لئے
اور تولیے کو ہاتھ میں تھامے
پھر اس جبرِ مسلسل کے لئے تیار ہوتے ہیں
گھڑی کی تال پر رقصاں
بے حس کیلنڈروں کے صفحے گنتے ہیں

☆☆☆

گٹر کے ایک انقلابی کیڑے کا ترانہ

نعرے ردی میں پھینکے ہوئے چند کنڈوم ہیں
حکمرانوں کی جوئے میں ہاری ہوئی داشتاؤں کے
چھوڑے ہوئے زیر جاموں کا اک ڈھیر ہے
یہ نظامِ کہن چوک میں بک رہی اک طوائف تو ہے
جس کا بھاؤ چکانے کو کتنے وڈیروں کی بازار میں بھیڑ ہے
اور جمہوریت ایک اُترن ہے لنڈے میں بکتی ہوئی
پوری آتی نہیں جسمِ بے جان پر
اور اس کی حفاظت پہ بیٹھا ہوا ایک جرنیل ہے
(جس کے بوڑھے مثانوں کے اندر بھی بارود ہے)
ریڈیو اور ٹی وی دو کتے ہیں
جو بھونکتے ہیں مگر ان کی زنجیر کھلتی نہیں
''دِین خطرے میں ہے.....
دیس خطرے میں ہے.....''
کیسٹوں میں فقط ایک ہی گیت ہے
بوڑھا بابا جو دو وقت کی روٹیوں کے لئے
عمر ساری کسی بیل کی طرح سے گھومتا ہی رہا
اس کو کیا تھا پتہ؟
پھول کلیاں بھی، خوشبو بھی جیون کے رستے کا اک موڑ ہیں
وہ تو جرنیل کے اردلی کی طرح خود میں ہی گم رہا
سر جھکائے ہوئے ہر قدم چپ رہا

وعدوں کی اجرک

مجھے تم رفاقت کے پل کا کوئی تحفہ بھیجو
سنہرے دوپٹے کے پلو سے باندھا وہی ایک وعدہ تو بھیجو
میں ان سے محبّت کی رعنائی لے کر
کھٹن زندگی کے اندھیرے سفر پر چلوں گا
کہ تیرے لئے روشنی، چاند، تارے، ہوا، خوشبوؤں
اور نغموں سے مہکا ہوا اک جہاں لے کے آؤں
جو اپنے حسیں خواب سا اک جہاں ہو
سو تم بھی وہ کمرے میں بیٹھی ہوئی
اندھی چڑیا کی آنکھوں میں اتری ہوئی سوئیاں چنتی رہنا
کہ اس ننھّی چڑیا کی آنکھیں
مرے اور تیرے ملن کے حسیں موسموں کی
شروعات کا استعارہ بنیں گی

☆☆☆

سرمد سروش

نام: ملک عمر خان
قلمی نام: سرمد سروش
ای میل: sarmadsarosh@hotmail.com
فون نمبر: 0334-5529266

شہرِ معتوب میں ہم نے مرنا نہیں

ہمیں بھی اجل آ دبوچے گی اک دن!
مگر ہم کسی اجنبی راستے پر مریں گے
کہیں بے کلی کے سبک گام گھوڑوں کی پتلی کمر سے
ڈھلک کر گریں گے
ہمیں شہر کے تنگ و تاریک خانوں میں،
بستر کی راحت میں، عورت کی صحبت سے سرشار،
کھانے کی ٹیبل پر، ٹی وی کے آگے
دفاتر میں کرسی پر بیٹھے ہوئے
جان سے ہاتھ دھونے نہیں ہیں
چلو یاں سے آگے بڑھو
ہم کبھی شہرِ معتوب کی عیش و عشرت میں شامل نہیں تھے،
مبادہ ہمیں کل کوئی ان میں گنتی کرے!!
برف کے اِن جلیدوں کو دیکھو، یہ کیسے بتاشے کے مانند گھلنے لگے
کتنی صدیوں کا پانی، دقیقہ دقیقہ سمندر کے پاتال میں گر رہا ہے
یہ جاروب آبی اِنہیں بھی کسی دن بہالائے گا
یاں ابھرنے کی ہم کو اجازت نہیں تھی
یہاں ڈوب کر ہم نے مرنا نہیں ہے
چلو اپنے گھوڑوں کو مہمیز دو
ہم کسی اجنبی راہ پر،
بے کلی کے سبک گام گھوڑوں پہ بیٹھے ہوئے جان دیں گے

CamScanner

زشت پائی پہ مغموم دانشور

اے غلام ابنِ آزاد!
کیا زندگانی کی تفہیم منطق سے بھی ہو سکی ہے؟
وہ کلیے جو مجھ کو خسارے میں رکھیں،

سراسر غلط ہیں
سبھی اختلافی دلیلیں فقط قابلِ مسترد ہیں
ہمیشہ ہوا ہے کہ مغلوب قوموں کے دانشوروں میں
حسن بن نثاروں کی کثرت رہی ہے
یہی ہیں وہ مینارِ جمرہ میں اپنے صنادید چنوانے والے
یہی ہیں وہ ہزرہ سرائی کے کنکر اٹھا کر رمی کرنے والے
یہی ہیں وہ گہرے سمندر کی تہہ میں اتر جانے والے
یہی ہیں وہ گہر و لآلی سے خالی صدف لانے والے
حسن بن نثاروں کی آنکھیں
گزشتہ کئی سو برس تک پہنچتی ہیں لیکن
کہیں روشنی کی رمق دیکھ پاتی نہیں ہیں
یہ طاؤسِ گریہ کناں
اپنی گردن جھکائے سدا زشت پائی کو دیکھا کیے ہیں
کبھی آئنے کے برابر نہ آئے ہیں
نہ آسکیں گے

☆☆☆

نظم سلجھائے گا کون!!

آپ گھبرائیں نہیں!
لوگ میری نظم کی تفہیم تک آئے تو کیا!!
یہ پسِ مفہوم کوئی نقش پا سکتے نہیں
آپ تک ہرگز بھی آسکتے نہیں

انگبیں کے ذائقے سے پھول تک آیا کوئی؟
کیا وجودِ گل کے معنی تک پہنچ پایا کوئی؟
معنویت کا لق و دق پار کر پایا کوئی؟
تجرید تک آیا کوئی؟
تجرید سے ماقبل کے جو ذائقے معدوم ہیں
انگبیں کے ذائقے میں وہ بھی سب مرقوم ہیں
ان کو چکھ پایا کوئی؟

آپ کیوں گھبرا گئیں!!
آپ تک آئے گا کون!!
نظم سلجھائے گا کون!!

☆☆☆

جوف!

بارہا میں نے گلگل بھی منہ میں نچوڑے،
زباں اپنے دانتوں میں رکھ کر دبائی،
بہت گرم چمچے سے داغا۔۔۔
مگر تیرے ہونٹوں کا بے نام سا ذائقہ یاد آیا نہیں
رات میں نے تو خود کو بھی حیرت زدہ کر دیا تھا
مجھے کیا خبر تھی کہ میرے دروں میں کوئی جوف ہے
جو سمندر کو پی کر بھی نہ بھر سکے گا
عجب آدمی ہوں!
کہ میں بیسیوں قسم کی گھاس پہچانتا ہوں،
ہوا میں رطوبت کی مقدار سے
کن مزاجوں پہ کیا رنگ چڑھتا ہے، میں جانتا ہوں
مگر اب تلک اپنے اوصافِ اسفنج سے نابلد تھا
ابھی صبحِ صادق کی کرنوں کے ہاتھوں نچوڑا گیا ہوں
تو اک کھوکھلے پن کے احساس سے بھر رہا ہوں
کوئی تشنگی ہے
کہ میں چاہے گلگل نچوڑوں،
زباں اپنے دانتوں سے کاٹوں،
بہت تیز سرکے کی بوتل چڑھاؤں،
وہ بے نام سا ذائقہ یاد آتا نہیں!

☆☆☆

ہم اکیلے ملیں گے

معذرت چاہتا ہوں!
تجھے میں کسی دوسرے دن اکیلا ملوں گا
میں خلوت پسند اور بجھیل آدمی ہوں
سو بالائی بالائی باتیں نہیں کر سکوں گا
سمندر کے لیول سے لازم گروں گا
گراں بار پتھر کے مانند، گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش کروں گا
بہت عامیانہ سی باتوں میں، علم و ادب اور دانش کے مضبوط تر لاسٹک کو پرو کر
میں قطبِ شمالی سے قطبِ جنوبی تلک،
طول و عرض البلد کی لکیروں کے مدمقابل گسوں گا
میں باتوں کا پورا تناظر سمجھنے کی کوشش کروں گا
سو بہتر یہی ہے تجھے میں کسی دوسرے دن اکیلا ملوں گا
یہ کیسے عجب لوگ تیرے تقرب میں ہیں
ایسے لسان و بسیار گو، بھڑ بھڑیوں کے آگے،
میں مورت بنا ایک عجمی دکھوں گا
کہ میں عورتوں اور مردوں کے کپڑوں کے نو سو چوالیس
جوتوں کے دو سو بیالیس، آرائشِ مو کے پن سو چھیالیس
اور گاڑیوں کی کئی ایک نسلوں وغیرہ کے اسماء سے نا آشنا ہوں
میں آدم کی اولادِ ناخواندہ ہوں
سو ترے مقرب فرشتہ صفت دوستوں میں خجل خوار ہوں گا
تجھے میں کسی دوسرے دن اکیلا ملوں گا

تخمِ دیوار

ایک ناچار ہوں
مثلِ ناکاشتہ تخمِ دیوار ہوں
اپنی قسمت کے پتھر سے دوچار ہوں
چاہ کر بھی میں اُن دیو قامت درختوں کو نہ پا سکوں گا کبھی
جن کے پیروں کو زرخیزیاں چومتی ہیں
میں فطرت کے جوئے میں ہارا ہوا شخص ہوں!
آسمانوں کی لاعدل میزان پر مجھ کو تولا گیا
زیست کی دوڑ میں ظلم سے دیر سے مجھ چھوڑا گیا
میں ترے لاڈلوں کے نشاں ڈھونڈتا رہ گیا
میں کہاں رہ گیا
عمر بھر میں نے جامِ حشیشِ قناعت پیا
اپنے پرکھوں کا تاریک جیون جیا
اک اساسی جبلّت سے بڑھ کر مجھے
زندگی کو منانے کا یارا نہیں
کارخانۂ قدرت کا ایندھن ہوں میں
دوسرا کوئی چارہ نہیں
اپنی محنت کے پودے کو خونِ جگر بھی پلاؤں تو کیا
آک پر آم آتے نہیں، جانتا ہوں مگر
مجھ پہ سایہ ہے یاجوج ماجوج کا
راہ کرنی ہے خلقی تفاوت کی دیوار میں
منہمک ہوں یہ اک کارِ بے کار میں

پرندوں کے ساتھ اُڑتی حسرتیں

اگر میں پھر سے بنایا جاؤں
تو اک پرندہ بنایا جاؤں
مری طبیعت پرندگاں کے قریب تر ہے
عظیم کونجوں کی ڈار کے سنگ
میں تخیّل اڑا رہا ہوں
یہ جون لے کر کے آدمی کی ازل سے جی کو جلا رہا ہوں
''وہ میرے گاؤں کا شہر خاموش
جب قیامت کے بعد مخلوق کو ملے گا
تو میرے آبا کی ہڈیاں کو
تلاش کر کے وہ یوں کہیں گے
یہ کیسا دوپایہ جانور تھا
کہ پیر اس کے فعالیت تک
پہنچ نہ پائے تھے ارتقا میں
یہ جیو جہد البقا میں شاید زمیں کے ٹکڑے سے جڑ گیا تھا
وہ بے قراری جو اس جہاں میں ہر ایک کو ہے
یہ جیو اس بے کلی سے شاید مکر گیا تھا''
مکر گیا ہوں مگر میں سرمد سروشؔ اس طرزِ زندگی سے
نکلنا چاہتا ہوں قید خانۂ آدمی سے

اگر مجھے پھر سے خلق کیجے
تو اپنی صورت نہ مجھ کو دیجے
کیا آدمی بن کے میں کیا ہے
کیا آدمی بن کے میں کروں گا

☆☆☆

جہانِ مور

یا علیم و یا حکیم!!
سوچتا ہوں چیونٹیوں کے بعد شاید
آدمی کا جنم لایعنی سا ہے
یہ لکیروں کی فقیری
یہ قلی گیری کے کام
اک جدو جہدِ جبلی ہے مدام
صبح خوراکی کے نام
شام خوراکی کے نام
چیونٹیوں سے زندگی کی غایتِ اولیٰ تمام
چیونٹیوں نے پائی ہے منزل کی بُو
آدمی میں کاوشِ مصدر کی خُو
ایک ہے معلول میں اور دوسرا علت میں گم
کام نہ آئے خزاں بسری میں جو،
آدمی اُس کام کی ذلت میں گم
آدمی کی عقل خام
اکتساب آدم کا کام
مور موروثی علام
ہے بلند اُس کا مقام
شوقِ استفہام میں یاں آدمی بدنام ہے
یہ جہانِ مور ہے یاں آدمی ناکام ہے

عبوری مسرت کا دن!!

یہ بازارِ معبد کھلا ہی رہے گا
زمانے کی منڈی میں مندی نہ ہوگی
ہمیں اپنا سودا ہی کرنا ہے سرمدؔ
سو کرتے رہیں گے۔۔۔ ہمیشہ کیا ہے!
مگر اک حسین دن فرشتوں سے نظریں چرا کر
یہاں آج ٹھہرا ہوا ہے
تو آؤ کہ ہم زندگانی کی لایعنیت کو
عبوری مسرت کے رنگوں سے بھر دیں
یہی اک ثوابوں کے نوٹوں کی گڈی،
کمائی ہے میں نے،
کہو تو میں امروز بیلیں لٹا دوں!
چلو آج دریا کنارے چلیں
عمر کی رائگانی بہانے کا دن ہے
یہ دن اپنی ہستی منانے کا دن ہے
عجب آرزو ہے کہ ہم ماورائے کشش،
آج آوارہ پھرتے رہیں
کائناتی اصولوں سے آزاد ہونے کا دن ہے
ابھی شام آئے گی ہم لوگ تھک جائیں گے
چار و نا چار واپس چلے جائیں گے

☆☆☆

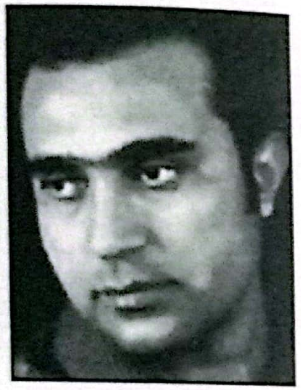

اگرچہ کونپلیں پھوٹیں

اگرچہ کونپلیں پھوٹیں مگر جاڑے کے موسم میں
تمنائیں کسی آغوشِ تربت میں جنم پائیں
مجھے وہ پھول بھائے تھے جو کملانے کو آئے تھے
میں جن لوگوں سے ملتا تھا اُنھیں جانے کی جلدی تھی
کسی خاموش ہوتی شمع کا پروانہ تھا سرمد
بہاریں کوچ کرتی تھیں میں جب گلشن میں آیا تھا
الاؤ سرد پایا تھا، افق پہ دھول دیکھی تھی
زمانہ کان تھا ہیروں کی میں نے کوئلہ پایا
میں سونا چھان کر دریا سے ریگستان لایا ہوں
ہمیشہ مادرِ قسمت کوئی مردار جنتی ہے
میں مرگِ نو پہ روتا ہوں یہ دنیا مجھ پہ ہنستی ہے

☆☆☆

سعید احمد

نام: سعید احمد
ای میل: saeedahmad18@gmail.com
فون نمبر: 0336-5612366
تصانیف: بے آب آئینوں کے شہر میں (شاعری)
تہذیب کی خطائیں (ترجمہ۔رزمیہ نظم)
دن کے نیلاب کا خواب (نظمیں)

CamScanner

میرے شجرے میں یہ تحریر کہاں

میں نہ ملّاح نہ ہی خانہ بدوشوں کے قبیلے سے ہوں
کلبلاتا ہے مگر کوئی سمندر مرے اندر کیونکر
اور رہ رہ کے نگاہوں سے چھپک جاتا ہے
ایک دروازہ جو صحرا کی طرف کھلتا ہے

میرے شجرے میں یہ تحریر کہاں ہے؟ کہ اب وجد میرے
دن بتاتے تھے سلگتے ہوئے سورج کی چمکتی ہوئی چھتری کے تلے
رات گھوڑوں کی معیت میں بسر کرتے تھے
وہ ہواؤں سے الجھتے ہوئے دریا سے گزر جاتے تھے
اور صحراؤں کی وسعت میں سما سکتے تھے

جانے میں کیوں یونہی انجان سے اک خواب کی تحویل میں دیوانہ ہوا
کلبلاہٹ سی سمندر کی جو محسوس ہوئی ہے مجھے اپنے اندر
اور رہ رہ کے نگاہوں سے چپکتا ہے
وہ دروازہ جو صحرا کی طرف کھلتا ہے

☆☆☆

تضادوں سے عبارت

دکھوں کے خیمے میں بیٹھ کر
نارسا خوشی کی خوشی میں ہنسنا
طویل وانجان ہجر کی خارزار پگڈنڈیوں پہ چلتے
وصال لمحوں کی خوشبوؤں میں رچی
کوئی نظم کہہ کے رونا
حواس کی دسترس میں ہونا
کبھی نہ ہونا
انہی تضادوں سے ذات کے ہاتھ کی لکیروں میں رمزِ معنی
انہی پہ قائم مرے تفکّر کے سلسلے سب
کلام وحسنِ کلام کے ڈھب

☆☆☆

ناممکن کے خواب

ہجر بھرے بے انت سمے کے صدیوں جیسے دن
ٹوٹی پھوٹی آس آشاؤں کی آس بھری اندھی راتیں
بل کھاتے سانپوں جیسے گنجل رستے
عمر سفر کا حاصل
تیری انجان گلی میں ویران پڑا ہے
اور اک دستک کے زیاں کا لمحہ
دیو بنا سر پہ کھڑا ہے

ناممکن کے خواب تُو اپنا دکھ دروازہ کھول
میں تیری دھرتی پر پھیلے موت نمک کو
اپنی پلکوں سے چن لوں
اور وصالِ فنا سے پہلے
ہریالی اوڑھی فصلوں کی سرشاری میں
تان اُڑاتی دوشیزہ کی
ملہار صدا سن لوں

☆☆☆

نامعلوم کے حسن کی قربت میں

رات کے ہاتھ پر گلاب کھلے
اور کھجوروں کے پیڑ صحرا میں
وصل کے سُرالا پتے دیکھے

خواہشوں کا بیاج ملنے کی
اک گھڑی خواب سی، نظر آئی
کھو گئے حسن کے سمندر میں

وقت، کبڑا، ضعیف، پہرے دار
چپکے چپکے پکارتا ہی رہا
صبح تک، سازشی ستاروں کو

عنبریں راستوں پہ چلتے ہوئے
اجنبی دھن میں گنگناتے ہوئے
دھیرے دھیرے یہ سوچتا جاؤں

حجرۂ خواب کی طرف چپ چاپ
کس کی آواز پر گیا تھا میں
کون تھا وہ، میں کون ہوں آخر

☆☆☆

۶۔ رات کے درخت سے

رات کے درخت سے
جس قدر سیاہیاں جھڑی تھیں کائنات پر
ماہتاب نے
سفید رنگ کے گلاب نے
اور ایک خواب نے
پل کے پل میں چوس لیں

پھر غنیم تیرگی کی بات کیا کرے کوئی
رات کے درخت کی
اکھڑتی سانس کا
یہ پات پات دیکھ کر
رات کے طلسم سے
کس لیے ڈرے کوئی

ذات کی کال کوٹھڑی سے آخری نشریہ

اب کوئی صحرا نہ اونٹوں کی قطاریں
گھنٹیاں سی جگمگاتی خواہشوں کی
دھیان کے کہرے میں لپٹی
گنگناتی ہیں مگر مضراب آئندہ سفر کے
راستوں کے ساز سے ناراض ہیں

میں اسی اندھی گلی کی قبر میں مرنے لگا
بھاگ نکلی تھی جہاں سے
زیست پیدائش کے دکھ دے کر مجھے

آنکھ سے چپکے نظاروں کے ہزاروں داغ ہیں
جو وقت کی بارش سے بھی دھلتے نہیں
کون سی دیوار میں رخنے ہیں کتنے
کون دروازوں کو کیسی چاٹ دیمک کی لگی ہے
کون سی چھت تک کسی نے
سیڑھیوں میں ٹھوکریں کتنی رکھی ہیں
ہر کہانی یاد ہے

سُن مرے ہمزاد سُن!
زندگی کے کھوج میں نقل مکانی
فرض ہے اب مجھ پہ لیکن
سرحدوں سے ماورا ہیں
یا ہوائیں یا صدائیں یا پرندے
میں تمنّا کے جہازوں کا مسافر
پاسپورٹوں اور ویزوں کے ایئر پاکٹ ڈراتے ہیں مجھے

☆☆☆

بے لکیر ہاتھوں میں تحریر دکھ

پھول پرائے موسم کا
اور ہوا اس کی خوشبو
میری سانسوں تک لے آئی
انجان سفر کا رستہ
میرے پاؤں تک لے آئی

وحشت کے شعلے سے تخلیق پرندہ
اور بھڑک اٹھا
لیکن
ماضی اور آئندہ کے آئینوں میں
عکس نمو پا نہ سکے
موجود زمانوں کے

گمنام اڑانوں کے بے چاند فلک
تیر گئے
آنکھوں کے پانی میں

بے ربط کہانی میں
جرم ہوا کا تھا
معتوب ہوئے کردار مگر

اب کون ہوا زنجیر کرے
اور اس سے پوچھے
قفل زدہ دروازوں پر
دستک سے پہلے
وہ کیوں چھوڑ گئی
پھول پرائے موسم کا

☆☆☆

ہم ذات سے ہمکلامی اور فراق

سچے خواب اور جھوٹی آنکھیں
اندھے رستوں کی ہمراہی
انجان تحیّر کا پانی
اور استفہامی لہجوں کی
دودھاری تلواریں
تیری قربِ سرائے سے
یہ زادِ سفر ساتھ لیا ہے

رخصت کے رخساروں پر
آنسو بن کر گرتے
لمحے کے ہاتھوں میں
اپنے ہونے کا آئینہ دے
میں اس کانچ بدن سے
بے نام اندیشوں کا
زنگار کھرچ ڈالوں
اور اجلے پانی میں دیکھ سکوں
ہجر نگر کے تپتے سورج کے نیچے
عمر سفر کا صحرا کتنے کوس پڑا ہے

☆☆☆

پھول بھنور کا

ناؤ کھیتے ڈھلتی عمروں کے ساون میں
پھول بھنور کا دیکھا دریا کے دامن میں
پھولوں سے پھول بہت پر وہ پھول نرالا
زندہ ہوتا جائے اس کی چاہت والا
گھنگور گھٹا میں طغیانی دیکھنے والی
دریا لہر و لہر اور اپنی لہر سوالی
کاش اک ایسی بھی لہر اٹھے من پر چائے
جس کارن پھول بھنور کا گلے ملتا جائے
باقی نہ رہیں ناؤ مانجھی اور کنارے
چاروں اور کھلیں نٹ کھٹ دریا کے دھارے
دھرتی بھر پائے ، پر دریا پایاب نہ ہو
یہ جاگتی آنکھوں کا خواب فقط خواب نہ ہو

☆☆☆

شہزاد نیّر

نام: محمد شہزاد

قلمی نام: شہزاد نیّر

ای میل: shahzadnayyar@hotmail.com

فون نمبر: 0321-8110989

تصانیف: چاک سے اترے وجود

گرہ کھلنے تک

برفاب

کہانی سوچتی ہے

لہو کے پھول چنتی
ساعتوں کے سائے میں بیٹھی
کہانی سوچتی ہے
اجتماعی قبر میں مدفون
امکانات کی لو
پانیوں کے لمس سے گھلتے ہوئے
الفاظ کی بے چہرگی
بوٹوں تلے روندے ہوئے
خستہ بدن اوراق سے
اندھی ہوا کی گفتگوئیں
کوئی لاانتہا کی آنکھ سے دیکھے
بجھی صدیوں کے باطل میں
قلم قابیل کا برحق
تماشے کی عدالت میں
بقائے منصفی کے نام پر آخر
برائے نام کیا ہوگا
اگر ہیر و دلن ہے تو
مرا انجام کیا ہوگا
کہانی سوچتی ہے

☆☆☆

CamScanner

ہدایت کار

نہیں یہ زاویہ اچھا نہیں
اِدھر سے روشنی ڈالو
آؤ اِدھر سے روشنی ڈالو
وہی منظر اُجاگر ہو جو میں نے سوچ رکھا ہے
اُٹھاؤ کیمرا، آگے بڑھو دیکھو!
فقط اُتنا دِکھاؤ جس قدر میں چاہتا ہوں

کیا؟
ارے لکھا ہوا ایسے نہیں پڑھتے

اداکاری تو ایسی ہو
کوئی بھی دیکھنے والا نہ یہ سمجھے
کہ جو کرتے ہو وہ پہلے سے لکھا جا چکا ہے
دیکھ لو، جینے کی نوٹنکی تو مرنے سے بھی مشکل ہے
ذرا مر کر دکھاؤ...... کٹ!

یہ مرنا ہے؟
ارے اس میں ذرا سی جان تو ڈالو
گذشتہ بھول جاؤ سب
وہی دیکھو جو میں آگے دکھاتا ہوں
مری ہر ''سین'' پر نظریں ہیں
کب کتنا چھپانا ہے
کہاں کتنا دکھانا ہے
کہانی کو کدھر سے موڑ دینا ہے

پرانی داستان اندر یہ منظر کس جگہ پر جوڑ دینا ہے
یہ سب کچھ جانتا ہوں میں
ذرا سے بیچ کے کردار ہو تم سب
تو بس اتنی غرض رکھو
کہاں آغاز تھا انجام کب ہوگا
تمھیں پوری کہانی سے کوئی مطلب؟
تمھیں تو جلد ہی میں مار ڈالوں گا
کہانی کار بھی میں ہوں!

☆☆☆

اندر کی جنگ

زمینِ جسم میں دردوں کی بارودی سُرنگیں ہیں
کبھی گولی کی صورت غم اُترتا ہے جو سینے میں
تو ایسے ذہن کے اندر سے سناٹے گزرتے ہیں
محاذِ جنگ کو جیسے ہزاروں ٹینک جاتے ہوں!
چلی آتی ہیں تنہائی کی فوجیں روند نے دل کو
دھنا دھن گرنے لگتے ہیں
اَلم کے توپخانے سے
اداسی کے کئی چنگھاڑتے گولے
اجڑتے دل کی دھرتی پر
کبھی جنگی جہازوں کی طرح آتے ہیں
ماضی کے حسیں قصّے
دکھوں کے بم، دھماکے کرنے لگتے ہیں
بدن میں پھٹنے لگتے ہیں
اچانک ایک زناٹے سے
مایوسی کا راکٹ آن گرتا ہے
زمینِ یاد جلتی ہے
دھواں آنکھوں تک آتا ہے
امیدوں کی جلی چیخیں نکلتی ہیں
فصیلِ جاں لرزتی ہے

تھکے ہاتھوں میں تھا ماضبط کا پرچم
زمیں پر گرنے لگتا ہے
جوابی کارروائی میں یہی کچھ اپنے بس میں ہے
بس اک یلغار اشکوں کی!

☆☆☆

ورکنگ وومن

دو نازک سے کاندھوں پر تم
کِتنا بوجھ اُٹھاتی ہو
گھر کی چھت کا
کمر توڑ مہنگائی، بھاری ٹیکسوں کا
دفتر کی ذمہ داری کا
تیز کسیلی باتوں، میلی نظروں کا
انگ انگ پر چلتی پھرتی آنکھوں کا
گلی میں بیٹھے وزنی فقروں
آنے والی کل کی بوجھل فکروں کا
کتنے بھاری پتھر ہیں!
بیتی یادوں
نئی محبّت کے وعدوں کا
گھنی گھنیری زلفوں کا!
دو ننّھے سے کاندھوں پر تم اِتنا بوجھ اُٹھاتی ہو
صنفِ نازک کہلاتی ہو!

☆☆☆

کفن چور

کچھ نہیں ، گھر میں مرے کچھ بھی نہیں
کوئی کپڑا کہ حرارت کو بدن میں رکھتا
لقمۂ نانِ جویں ، خون کو دھکّا دیتا
من کو گرما تا سکوں ، تن سے لپٹتا بستر
کچھ نہیں ، کچھ بھی نہیں ، کچھ بھی نہیں

رات کو جسم سے چپکاتی ہوئی سرد ہوا
جسم کے بند مساموں میں اُترتی ٹھنڈک
سنگِ مرمری ہوئیں خون ترستی پوریں
ہاتھ لرزاں تھے، امیدوں نے مگر تھام لیے
پاؤں چلتے ہی رہے شہرِ خموشاں کی طرف

پردۂ خاک میں لپٹے ہوئے بے جان وجود!
باعثِ ننگِ زمیں ہوں، مگر اک بات بتا
جسم مٹی ہوتو کپڑوں کی ضرورت کیا ہے؟
دیکھ پیوندِ زمیں! میرے تنِ عریاں پر
داغِ افلاس کا پیوند..... اجازت دے دے
مرکے مرتے ہوئے انسان کو زندہ کردے
ایک ملبوس کمانے کی اجازت دے دے
ورنہ بھوکی ہے بہت خاک، کہاں دیکھے گی
جسم کھا جائے گی، پوشاک کہاں دیکھے گی!

چاہے جانے کی آرزو

وہاں نادیدہ منظر کی بہت ویران آنکھیں تھیں
ڈھلانی پھول کھلتے تھے
مگر حیرت کی بارش کو ترستے، سُوکھ جاتے تھے
ہَوا کا لمس، بادل کی نگہ کافی نہیں ہوتی
کبھی چڑیوں کی بوندیں گر پڑیں
تو منظروں کی سُوکھتی آنکھوں نے رنگوں کا ذخیرہ کرلیا
چشمِ تماشا کون لائے گا
کسی کی آنکھ میں آئے بِنا ہوتے چلے جانا
بڑی بھاری اَذیّت ہے
(ذرا پہلے یہ اُس مخفی خزانے نے بھی سوچا تھا!)
عصا تھامے
وہاں کچھ آفتابی ٹوپیاں آئیں
زمیں کی خوردبینی کی.....
تو پھر آنکھوں کی بارش تھی
نگاہوں کی گھنی آبادیاں اُتریں
اَزل سے اَن دِکھے منظر
نظر تک بَھرتے جاتے تھے!
مِری آنکھوں کے منظر کون دیکھے گا
کہ مَیں نے بھی
نظر آنے کی خواہش میں دفینے کھول ڈالے ہَیں!!

کارگل

قدم معتبر ہیں
کہ سارے بدن کو اُٹھائے چلے ہیں
زمیں کی جبیں سلوٹوں سے بھری ہے
انھیں سلوٹوں پر قدم، چلتے چلتے
کہیں آکے ٹھہرے
تو مغرور دھرتی کی اُونچی
تنی ناک تلووں کے نیچے!

ہوائیں غضب ناک ہو ہو کے آئیں
تو قدموں پہ استادہ جسموں نے روکا
جونہی غول سیسے کے اُڑتے ہوئے آئے
سینوں نے وُہ اپنے اندر پروے!
شکم میں نئی بھوک لقمے اُتارے
بدن اپنے کم زور بازو سے
برفانی طوفاں سے لڑتا رہا
آنکھ نے نیند کو برف میں دفن کر ڈالا
بیداری پہروں کھڑی ہی رہی!
سرحدیں جاگتی تھیں
عقب سو گیا تھا!!

بے نیازِ مکاں

اندھیرا سرکتا تھا
گلی کے ملبوں والے گھروں
لڑکھڑاہٹ میں اک دُوسرے سے اُلجھتی ہوئی
اندھیری گلیوں میں بہتا ہوا
کھڑکی کے موٹے کواڑوں سے چھنتے ہوئے
کچے کمروں کی مٹی گراتی
چھتوں سے ٹپکتی ہوئی باس میں گھل گیا
رنگ پتوں کی کڑیوں سے رِستا اندھیرا
ٹھہرتا نہیں تھا کہ سُورج پھسلتا تھا!

غربت، عقیدت سے لبریز بستی
اندھیرے میں گرتی تھی
لیکن دمکتے ہوئے
رنگ روغن کی پوشاک پہنے
چمک دار معبد کے اونچے
منارے پہ کرنوں کا میلا تھا
کچے گھروندوں کی دیواروں نے
اپنے حصے کی کرنیں ملا کر
خدا کی رہائش کی خاطر
اُساری گئی پختگی پر اُلٹ دی تھیں

پکّے مُنارے سے کچّی سماعت میں آواز اُتری:
خدالامکاں ہے!!

☆☆☆

کارگل

قدم معتبر ہیں
کہ سارے بدن کو اُٹھائے چلے ہیں
زمیں کی جبیں سلوٹوں سے بھری ہے
انھیں سلوٹوں پر قدم، چلتے چلتے
کہیں آکے ٹھہرے
تو مغرور دھرتی کی اُونچی
تنی ناک تلووں کے نیچے!

ہوائیں غضب ناک ہو ہو کے آئیں
تو قدموں پہ اِستادہ جسموں نے روکا
جونہی غول سیسے کے اُڑتے ہوئے آئے
سینوں نے وہ اپنے اندر پروئے!
شکم میں کئی بھوک لقمے اُتارے
بدن اپنے کم زور بازو سے
بَرفانی طوفاں سے لڑتا رہا
آنکھ نے نیند کو برف میں دفن کر ڈالا
بیداری پہروں کھڑی ہی رہی!
سرحدیں جاگتی تھیں
عقب سو گیا تھا!!

بے نیازِ مکاں

اَندھیرا سر کتا تھا
مٹی کے ملبوس والے گھروں
لڑکھڑاہٹ میں اِک دُوسرے سے اُلجھتی ہوئی
ٹیڑھی گلیوں میں بہتا ہوا
ہاتھ کھڈی کے موٹے کواڑوں سے چھنتے ہوئے
کچے کمروں کی مٹی گراتی
چھتوں سے ٹپکتی ہوئی باس میں گھل گیا
خشک پتوں کی کڑیوں سے رِستا اَندھیرا
ٹھہرتا نہیں تھا کہ سُورج پھسلتا تھا!

غربت، عقیدت سے لبریز بستی
اَندھیرے میں گرتی تھی
لیکن دمکتے ہوئے
رنگ روغن کی پوشاک پہنے
چمک دار معبد کے اونچے
مُنارے پہ کرنوں کا میلا تھا
کچے گھروندوں کی دیواروں نے
اَپنے حصّے کی کرنیں ملا کر
خدا کی رہائش کی خاطر
اُساری گئی پختگی پر اُلٹ دی تھیں
پکّے مُنارے سے کچّی سماعت میں آواز اُتری:
خدالامکاں ہے!!

☆☆☆

ٹھہری ہوئی ساعت

مِرے دِل کے کناروں سے
تمھاری رُوح کی اُونچی منڈیروں تک
کئی دُنیائیں آتی ہیں
منڈیریں، جن پہ خوابوں کے
حسیں پنچھی اُترتے ہیں
خدائی گیت گاتے ہیں
سنہری رنگ سے
اَرض وسما کی سب حدوں سے دُور
چمکیلی، نئی دُنیا بساتے ہیں!

تمہاری آنکھ کی کِرنیں
مکاں ولامکاں کے درمیاں
ٹھہری ہوئی ساعت کے پہلو جگمگاتی ہیں
وہ ساعت جو مُعلّق ہے
ہمارے درمیاں
جس کی رُوپہلی روشنی سے
دیدہ ودِل نور پاتے ہیں!

یہ دُنیائیں ہمارے درمیاں ٹھہری ہوئی ہیں
یوں گزر جائیں
کہ ہم دامن پہ اِن کی گرد بھی پڑنے نہ دیں،
آگے نکل جائیں!!

☆☆☆

سال گرہ کے دِن

میری چھتری پہ رَنگلے کبُوتر اُترنے لگے
کس نزاکت سے وُہ مہرباں اُنگلیاں
رقص کرتے ہوئے خَم سے نیچے گئیں
دِل کے تصویر خانے سے اِک نقش اُوپر کیا
ساتھ حَرفوں کی مالا پروئی
بھلی خواہشوں میں لپیٹا
دُعاؤں کے شہپر دیے اَور رُخصت کیا
ساز بجتے رہے اَور قاصد کبوتر اُترتے رہے!
مَیں نے بھی دِل کا صَندُوق کھولا
جوابی دُعاؤں کو سیدھی قطاروں میں رکھا
بہ صد شکریہ سُرخ فیتہ لگایا
بس اِک مخملیں سا دَباؤ
کئی سمت میں
دُور ونزدِیک کی منزِلوں کو کبوتر اُڑائے
سبھی بَرق پَر
سب کو اَپنے ٹھکانے کا اِدراک تھا
ایک پَل میں گئے
میری خوشیوں کو پَر لگ گئے!
کاش اِتنی حسیں مہرباں اُنگلیوں میں
وہ دو نرم پوریں بھی ہوتیں!!

CamScanner

نشّہ

طلوعِ زماں سے غروبِ مکاں تک
حکومت ہے غم کی، لگا تار غم کی
اَبد تاب صَحرا کا پھیلاؤ دُکھ ہے
سَراب ایک سُکھ ہے
محبت بھی غم، اس کی غایت بھی غم
دِل پرستو، خوشی کی نہایت بھی غم!
کبھی آبشارِ طرب نے بدن کو بھگویا
خوشی چہچہاتے ہوئے دل تک آئی
بہاؤ بہانے لگا
تو اَچانک بدن ٹوٹنے لگ پڑا
اک ضرورت کی کلیاں چٹکنے لگیں
اُسی آن دل نے کہا:
کوئی دُکھ...... کوئی آنسو
طرب کے دُھندلکے ہٹاتا ہوا
کوئی غم آنکھ میں آن چمکے
اندھیرے گراتا ہوا!

غم کے نشے کی بڑھتی طلب
دِل کی ویران وتاریک گلیاں
کوئی دَر کُشادہ ہوا
اک بھلائے ہوئے غم کا زہراب
جلتی رگوں میں اترتے ہی
ٹوٹا بدن پھر سے جڑنے لگا
غم مسیحا مرا......!

☆☆☆

عامر سہیل

نام: مخدوم عامر ندیم
قلمی نام: عامر سہیل
فون نمبر: 0300-7972919
تصانیف: لبادہ
تیوہار کا پانی
مشہدِ عشق
غدر کے پھول
عشق کی چادر
کچھ طاہر پنکھ گراتے ہیں
وجلہ ٔ دل، زبورِ عشق
اک نخرو باغ سے چنتا ہوں

دو ہونٹوں کو مہمان کریں

کسی نظم کی کوئی جھات پڑے
کہیں بوند گرے، کہیں رات پڑے
کوئی کہر بسیرا کرے کہیں
اک گونج سویرا کرے کہیں
کسی انت کے گھاٹ پہ صبح ملے
کہیں سہج سہج اک دِشا چلے
کہیں دو نینوں میں نظم جلے
کسی بادل سے اشنان کریں
دو ہونٹوں کو مہمان کریں
اک بارش کو حیران کریں

☆☆☆

اشانت راتوں کی ایک نظم

کہانیاں مت کہو کہ راتیں
اشانت ہیں اور حاملہ ہیں
دنوں کی روندی ہوئی ہیں
عدت کی بالکونی میں بیٹھی
عمریں گزاری ہیں
لہو کی شہوت سے کانپ جاتی ہیں
کچے جسموں کی باس سے
روز کھانستی ہیں
قدیم تنہائیاں عزادار ساعتوں کی
بدن پہ راکھ اور اُلجھے بالوں کا
جھاڑ جھنکاڑ جیسے سبھی قطار
مزدور عورتوں کی
زمیں نے تہمتوں کے انبار
یوں اکٹھے کیے ہیں
جیسے کوئی ابھاگن
دکھوں کے چرنوں
میں بیٹھ کر سیلے مندروں کے
سہاگ کے دن کو کوستی ہے

زمین عشوہ فروش کُٹنی
جو صبح کے برتنوں میں آبِ ریا
کو بھر بھر کے بیچتی ہے
جہان سوداگروں کا لٹھا
حریص بنیا
جسے بس اپنے ہی بھاؤ تاؤ کی
اپنے بیوپار کی پڑی ہے
کہانیاں مت کہو کہ
چپ کی اچھوت آنکھیں
سہمے کے چالاک پنڈتوں سے
ڈری ہوئی ہیں
کہیں خیانت کی تشتری میں
دھری ہوئی ہیں

☆☆☆

ایشیا جھاڑ جھکاڑ

ایشیا جھاڑ جنکاڑ کا خاک داں
ایشیا زرد چمڑی کا، مزدور، تنہائی کا میزباں
ایشیا بھیگے اُپلوں کی، ریشم لدی سردیوں کا بیاں
ایشیا چیتھڑوں، جھگیوں اور غربت کی
خانہ بدوشی کی گُھپ داستاں
ایشیا ذات کی!
جس کی لٹ میں کمائی لٹی رات کی
ایشیا کُھردری رونقوں کی چٹائی
جو بہتی نہیں آنکھ برسات کی
ساونوں کے محلے میں ہلکان ہیں
ہم ترے قہوہ خانوں کے مہمان ہیں
زخم ہیں عصر کی بے وفائی کے، گُت پہ
سمندر کے سینے پہ بہتان ہیں
نیل پالش پہ دھڑے کے کُھدے ہیں
ترے لائنر کی نمی سے پریشان ہیں
اب کلائی سے چڑتی چلی جا رہی ہے

وہ راکھی برہمن نے باندھی تھی جو
اب وہ خندق گلو سے ملے بھی
ترے چھلکتے عُشاق کی بے قراری نے
سکتے میں پھاندی تھی جو
چھاتیاں سانس تک
لے نہیں پار ہیں، تیری پشواز پر
ایسی آندھی تھی وہ
جس پہ ہنستی تھی بیہودگی رات کی
ایشیا بدنصیبی کی وحشت نے
قصبوں میں بہتات کی
تیرے ماتھے سے سجدے بچھڑ جائیں گے
کچے جسموں کی تو نے جو خیرات کی
اس جزیرے کے پر

☆☆☆

آبنوسی سویرا

کاسنی آسمانی ہواؤں میں
گھلتا ہوا آنجہانی دنوں کا اندھیرا
کہاں گھر میں رکھیں مہاجر صداؤں کو
اور ان کے پیروں پہ چلتا ہوا آبنوسی سویرا
کہاں بے ثمر بے پلک نیند چھڑکیں سو بستر لگائیں
کہاں آنسوؤں کا......
گھروں آنگنوں کو اجازت نہیں ہے
کہ وہ قحط میں آفتوں کے
دنوں میں بھی استھان چھوڑیں
جدائی کی جدول میں
تذلیل کے حاشیے میں
ندامت کی تقویم میں
بس دلاسوں کے ہندسے......
زحل اور مریخ کی بے نحوست
کہیں برکتوں والی گھڑیوں کے چھینٹے
نہیں دکھ رہے ہیں

مگر آنجہانی دنوں کا اندھیرا
مہینوں کی فرغل میں ناموں کے
ادھڑے ہوئے کاج، استر
مزاروں پہ بیٹھے ہوئے ہیں مگر
منتیں پوری ہونے کی مدت سے پہلے ہی
سٹھیا گئے ہیں
ڈھلکتی ہوئی گردنیں
بے یقینی کے کتبوں پہ رکھے
مہاجر صدائیں گھروں، آنگنوں کا پتا پوچھتی ہیں

☆☆☆

بپتا

کوئی کھاد
کٹیلے وعدوں کی
کوئی یاد کسیلے بھادوں کی
اِک ہجر سے بھارتی کُرتی پر
انگی اور اٹک کے سہم گئی
اک تخت میں آنسو جڑا رہا
اک بخت پہ ساون کھڑا رہا
زہسل کی نوک پہ خواب دھرو
تعویذوں والی ناب دھرو
کیوں دیس نکالا ملا نہیں
وہ بپتا ماری آنکھوں کو
دو دھاری کھاری آنکھوں کو
پردیس سے پنچھی مُڑے نہیں
دو انگ سلونے جُڑے نہیں
نے شہد بہا دو ہونٹوں سے
نا جاری نہر پسینے سے
نے خنجر نے اشلوک کہے

اِک کاروکاری سینے سے
نارات ڈھلے شہزادی نے
پستان ڈھکے پشمینے سے
دو شبدوں کے تعویز ملے
اِک چتا کو اُکھڑ زینے سے

☆☆☆

برف کا اسٹیج

برف کا اسٹیج خاکی پنڈلیاں
بھوری لویں
بے ریا شانوں سے رک رک کر پھسلتی چادریں
تاگا تاگا کاغذی جسموں کی
کھلتی بندشیں
(تالیاں بجتی ہیں کوری تالیاں)
برف جھکتی ہے زمیں پر
برف گھبرائی ہوئی
حسن کی یہ حاکمیت
خواب سے آئی ہوئی
برف تھوڑا اور جھک جاؤ
زمیں معتوب ہے
حسن کا پہلا پڑاؤ ہے
ابھی محجوب ہے
حسن جیسے اس زمیں پر
جھکڑوں اور بجلیوں کے شور سے
ہو کر خدا
رنگ صحنوں میں بہا دے
اور پھر پکڑے کلائی آب کی
برف کے قالین پر وہ حسن کی بہتات ہے
پانیوں میں جل رہی ہے بے رُخی کی مشعلیں
کیسی کالی رات ہے؟.....
ہاتھ جھڑے جاتے ہیں برفیلے تمام
برف کے گرتے ہیں پردے
(تالیاں.....ہیجڑوں کی تالیاں)
جو کہ ان ہیں پایا میں وہ بین السطور دیکھو!
سروں پہ دھاتی طیور دیکھو!

☆☆☆

بدل ڈالے ہیں اپنے دستخط.....

لہو سے لفظ گوندھے ہیں
بہت میں نے
ہزیمت آنکھ سے اٹھتی نہیں ہے
بیسوا آنکھوں کی عجلت میں
لکھے ہیں روز خط میں نے
تری دنیا کو کیا تبدیل کرتی
میری خوش فہمی!
تری دنیا کے چابک
پیٹھ پر کھا کر
لکھی نظموں کو اپنے گھر کے
پچھواڑے میں دفنا کر
(کوئی جنموں جلی جیسے اندھرے میں)
خدا سے اور مخلوق خدا سے چھپ
چھپا کر کوکھ سے نکلی ڈلی کو
اک گڑھے میں کانپتے ہاتھوں سے
لٹھے میں چھپا کر دفن کرتی ہے
کچھ ایسے ہی لکھی نظموں کو
اپنے گھر کے پچھواڑے میں دفنا کر
بدل ڈالے ہیں اپنے دستخط میں نے

☆☆☆

CamScanner

دو مٹھّی میگھ

اک تیز کٹاری بھیروں کی
اور سوئیاں جسم میں چبھی ہوئی
کسی بنجارن کی کُرتی میں
دو کھتری آنکھیں کُھبی ہوئیں
اک خنجر زہری شبدوں کا
اک چوڑا سینہ کاٹ گیا
دو مٹھّی میگھ زمینوں پر
اک کھنچی لکیر کو پاٹ گیا
پر سرحد پار کی کونجوں نے
سرسوں کا گیت سنا ہی نہیں
بادل کے سوت سے اس دل نے
پھر رنگلا کھیس بُنا ہی نہیں

☆☆☆

نظمیں کہنے کا فن ہم نے.....

نظمیں کہنے کا فن ہم نے
بھولپنے اور بچپن کے دالان سے سیکھا
اوزاروں، ہتھیاروں سے
اور اُونٹوں کی کوہان سے سیکھا،
آسائش میں گھِری ہوئی خوش فہمی کاٹی
بارش کے چھینٹے تھے یا تیزاب بدن پر
بے خوابی کی چھتری لے کر
شہر میں گھومے..... صحرا میں گزران سے سیکھا
شہ رگ پر اِک خنجر نے جو گھات لگائی
شہوت کو مہجوری کے دانتوں سے پیسا
دو ہونٹوں کی گرہ لگائی
کُرتی کے اور انگیا کے ہیجان سے سیکھا
نیم کے پتوں کا سرگم، شیشم کی چھاؤں
منہدی کی توہین سے سہا ہوا وہ گاؤں
کاجل کے ایمان سے سینچی گئی حویلی
دیے کی لو سے ترخ گئی اک رات اکیلی
رات نے جھر جھر..... جھرنا
اِک مہمان سے سیکھا

انگاروں پر پیر دھرے تو چلنا آیا
شریانوں میں دھوپ بھری تو، جلنا آیا
اَبر، ہوا، طوفان سے سیکھا
ستلج کی دلداری سے
مہران سے سیکھا
نظمیں کہنے کا فن ہم نے
صحرا میں گزران سے سیکھا!

☆☆☆

CamScanner

عصمت حنیف

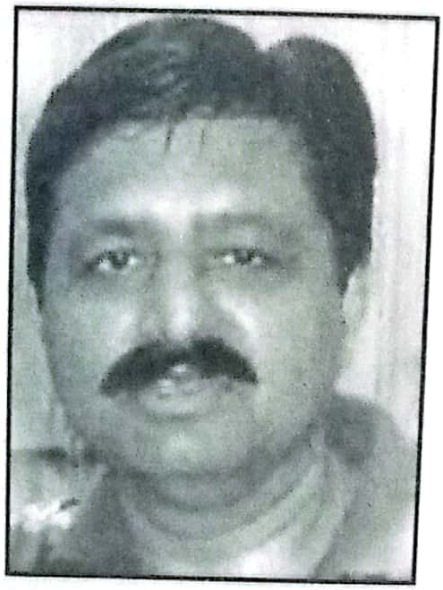

نام: محمد عصمت اعوان

قلمی نام: عصمت حنیف

ای میل: masmatawan@gmail.com

فون نمبر: 0321-5394400

تصنیف: نیلی نیند کے سپنے

CamScanner

گاڈ پارٹیکل (God Particle)

عطارد، مشتری زہرہ
ہتھیلی پر مری
ترتیب سے رکھے تھے

خطِ عمر
بالکل وسط سے ٹوٹا ہوا تھا

اور خطِ دل
جہاں گہرا ہوا تھا
عین اس جا دائرہ بھی بن رہا تھا

شمس، جو شفاف تھا
وہ اب جزیروں میں گھرا تھا

چاند کے نچلے کنارے پر
مثلث سی ابھر آئی تھی

جانے کتنی راتوں سے
مسلسل مجھ کو
نیلی نیند کے سپنوں میں
گہرے پانیوں کی سمت
جانے کا اشارہ ہو رہا تھا

وسطِ خیمہ گاہ کا منظر عجب ہے
برج، سیارے، ستارے، کہکشائیں اور کواکب

ایک ہی نیلے بہاؤ کا تسلسل ہیں
زمانے ایک ہی رَہ کے مسافر ہیں
بس اک مرکز ہے
جس کے گرد گردش ہے
بس اک نقطہ ہے
جس میں وسعتیں ساری سمٹتا ہیں

کوئی آواز تھی
جس نے مرکّب کو مرے
ہیجان میں رکھا ہوا ہے
میں،
بنی آدم
جو اس آواز پر
اپنی گواہی دے چکا ہوں
اِک مسلسل بے کلی میں ہوں

ازل اپنے کناروں پر کہیں محوِ تماشا ہے
تماشا گاہ میں
آدم تماشا ہے

CamScanner

زندگی سے باہر گرا ہوا ایک دن

میں شاید وقت کی ڈھلوان سے پھسلا تھا
اور پھر دائرے کی کھینچ سے باہر نکل آیا تھا
گردش کی طنابیں توڑ کر
اک اجنبی وسعت کی آسودہ پناہوں میں سمٹ آیا تھا
تا حد نظر سرسبز نیلے سرمئی اسرار میں
لپٹی ہوئی وسعت
مکاں تا لامکاں پھیلی
سنہری دوپہر کے تھال میں
مخمور سناٹے کے بھیدوں میں
دراڑیں ڈالتی بے چہرہ آوازیں
یہ میں کس منطقے پر تھا!
مرے کانوں میں بچپن کی کسی لوری کی آوازیں چھنکتی تھیں
مری آنکھوں میں اک معدوم ہوتے خواب کا منظر دمکتا تھا

☆☆☆

آئینے

رات چالاک ہے
جو بھی کچھ دیکھتی ہے اُسے
اپنے سینے کی گہری گپھاؤں میں
رکھ چھوڑتی ہے
کوئی بھید دیتی نہیں

رات عیّار ہے
روشنی سے بظاہر اُلجھتی نہیں
پر ہواؤں سے مل کر
(ہوائیں کہ جو ننگی تلواریں ہیں)
روشنی دیتے خوابوں، چراغوں کے زرّیں بدن
کاٹ دیتی ہے یہ

رات بے باک ہے
اس لئے بھی کہ یہ وقفِ راز ہے
راز کی پوٹلی کو اگر چوک میں کھول دے
تو تعفن بھرے حبس میں
منظروں کا تنفس بھی رکنے لگے
رات سفّاک ہے
درگزر اس کی فطرت نہیں
اس کی آنکھوں میں ٹھہری ہوئی بربریّت ہے
صدیوں پہ پھیلی ہوئی
ہم اس رات کے آئینے
شب گزیدہ،
اندھیروں میں لتھڑے ہوئے
اپنے ہونے پہ افسردہ ہیں
اور اِسی رات کے
ہم بھی پروردہ ہیں

☆☆☆

درد! ذرا دروازہ کھول

خوش بو کے گھر جاتے جاتے
تتلی رستہ بھول گئی ہے
شام کی شاخ پہ کھلنے والے
گُلِ سیاہ کی آنکھوں میں
اِک رُو پہلی مسکان اُتر کر ڈوب گئی ہے
تپتی دو پہروں کے مسافر
اُس لہجے کو ڈھونڈ رہے ہیں
جس کی چھاؤں میں ٹھہر کے
اپنی تھکن اتارا کرتے تھے
اُن آنکھوں کو کھوج رہے ہیں
جن کی اُجلی گہرائی میں اُتر کر
اپنا آپ سنوارا کرتے تھے
لیکن چہرے دھند میں ہیں
اور لمحے گُنگ کھڑے ہیں
سامنے بے منزل کا رستہ
جس پر گھات لگائے بیٹھے سناٹے
درد! ذرا دروازہ کھول!
دیکھ! تری دہلیز پہ دل کب سے بیٹھا ہے

☆☆☆

شفٹ + ڈیلیٹ (Shift+Delete)

اور یک لخت اک خواب
دو لخت ہو کر کہیں
جاگتی آنکھ میں گر پڑا
خواب کی خودکشی سے معمّہ سلجھ جائے گا
جاگتی آنکھ کا ------؟
(کیا خبر)
کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے
اندھیرے کی آکاس بیل
ایسے چمٹی ہوئی ہے
اُجالے سے دل کے
کہ پورے بدن میں
لہو کی جگہ ظلمتیں دوڑتی ہیں ------
کوئی لمحہ بھر مَیں نے کرسر (Cursor) کو دیکھا
ستارے کی مانند جھلمل کیے جا رہا تھا
منوّر جبیں پر کہیں بھی
کوئی سُرخ چھینٹا نہیں تھا
مرے کمپیوٹر کو یادوں کے فولڈر میں رکھے ہوئے
ایک البم کے مرنے کا شاید
پتا ہی نہیں چل سکا

☆☆☆

کوئی بھی دَر نہیں کھلتا

یہ میری دستکوں کا لمس
اتنا اجنبی کیوں ہے
کوئی بھی دَر نہیں کھلتا
جھروکے سے کسی آہٹ کی بانہیں
وا نہیں ہوتیں
نہ کوئی منتظر آنکھیں
درِ اُمّید کی درزوں پر بوسے ثبت کرتی ہیں
دریچے کی سلاخوں سے ادھر مَیں ہوں
اُدھر کمرے میں ٹیبل پر رکھی ہوئی
اِک مسکراہٹ ہے
جو دھیرے سے مجھے آواز دیتی ہے
وہیں گُل دان میں کچھ سبز رُو شاخیں
خوابوں کی
جو میری آنکھ کی پتلی میں آ رہنے کی بے تابی میں
لرزاں ہیں
مگر مَیں
وقت کی کترن اُٹھانے میں مگن ہوں

☆☆☆

خمار میں پڑے ہوئے

ہمیں کوئی نہیں جگائے گا
ہمارے جسم
مستعار نیند کے خُمار میں پڑے ہوئے ہیں
سوچ کے اُگال دان
درآمدہ سخن کی پیک سے اَٹے ہوئے ہیں
نظریے کی ایش ٹرے میں
راکھ اُڑ رہی ہے دانش و خیال کی
کنارِ دل سے جو طلوع ہو رہی ہیں آہٹیں
اب اُن کی روشنی
سماعتوں پہ بار ہے
نگاہیں لمسِ خواب تک بھُلا چکی ہیں
خواب-----
جن کے دستِ مرمریں کو تھام کے
ہم ایک عمر سے رواں تھے کھوئی منزلوں کی سمت
اب وہ خواب راستوں میں رکھ دیے گئے ہیں
پتھروں کے درمیان
ٹھوکروں کے درمیان
اور ہمارے جسم--------

☆☆☆

CamScanner

سوال

کہاں ہے چشمِ باخبر!
اُسے تو اپنی پیش بینیوں پہ ناز تھا
اُسے تو اپنی آگہی پہ اس قدر غرور تھا
کہ جیسے نبضِ ساعتِ رواں بھی اس کی دسترس میں ہو
مگر یہ کیا ہوا۔۔۔۔۔۔!
مگر یہ کیا ہوا
کہ چشمِ آشنائے یار پر رموزِ خوئے دلبری نہ کھل سکے
نگاہ راز آشنا
مزاجِ دوستاں کی چیرہ دستیوں سے بے خبر رہی
وہ چشمِ خوش قیاس
خوش قیاس ہی رہی
کہاں ہے چشمِ باخبر!
کوئی اسے خبر کرے
کہ قصہ جفا کے بعد اَب
نصیبِ جادہ وفا مزید امتحان ہیں
دلِ حزیں میں اب فقط گمان ہی گمان ہیں
چنار نیم جان ہیں
بدن فگار شام کی پنہ میں مہرِ بے اماں اُتر
طلوعِ صبحِ خوش خرام ہے ہنوز اک خبر
فقط خبر

اُلجھن

ہمارے دن کہیں تقویم سے باہر گرے ہیں

ہم تو جیسے
وقت کے لیجر (Ledger) میں لکھے وہ عدد ہیں
جن کو دیمک چاٹ لیتی ہے
عجب سی کیفیت ہے
زندگی
پچھلے برس کے دو چروں کے ساتھ
جیسے سِل گئی ہے
آہنی (فائر پروف) الماریوں کے بیچ رکھی ہے
مقفل۔۔۔۔۔
اور ہمارے خواب
پینڈنگ (Pending) فائلوں میں
دب گئے ہیں
آرزوئیں فون کی گھنٹی سے لپٹی ہیں
گھڑی کی سوئیوں سے
عمر کے لمحے
اُلجھ کر رہ گئے ہیں
زائچوں میں خواہشوں کا عکس تکنا

ٹھیک ہے لیکن
ستارے کب مقام اپنا بدلتے ہیں
مشقت
منحرف ہونے کی خود سے
کون اٹھائے
حوصلہ درکار ہے
شیشے کے کمرے میں
بڑی افتادگی ہے روز و شب کی
اور ہماری میز پر رکھے ہوئے
سب گوشوارے نامکمل ہیں
کسی بھی طور
ہم سے
عصر کا میزانیہ بیلنس نہیں ہوتا

☆☆☆

CamScanner

خواب ای میل نہیں ہو سکتے

ہم نے اپنے خواب تری آنکھوں میں رکھے
اور ترے پیروں کے ساتھ مسافت باندھی
تجھ کو اک چھتنار تلے سے باہر کھینچا
اور کڑکتی دوپہروں کو سونپ دیا
یوں تو ہم سے تُو بس ایک کلک (Click) کی دوری پر تھا
جب بھی چاہا
بارہ آٹھ کی چھوٹی سی سکرین پہ ہم نے
تجھ کو مجسم کر ڈالا اور باتیں کیں
پر باتوں کی گرمی میں تجھ کو ٹھنڈی سانسوں کا احساس
بھلا کب ہو سکتا تھا
ڈیسک ٹاپ (Desk Top) پر
جذبوں کے آئی کون (Icon) بنانا کب ممکن تھا
آنکھوں کا نم
ہم نیٹ ورک پر کیسے لاتے
کیسے ہم سمجھاتے تجھ کو
خواب ای میل نہیں ہو سکتے

☆☆☆

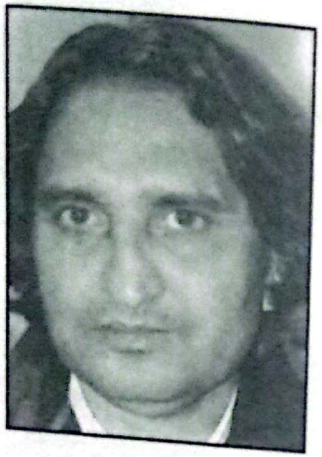

علی اکبر ناطق

نام: علی اکبر
قلمی نام: علی اکبر ناطق
ای میل: natiq51214@yahoo.com
فون نمبر: 0323-5389312
تصانیف: بے یقین بستیوں میں
قائم دین
یاقوت کے ورق
نولکھی کوٹھی
ہیئتِ شعر
سرمنڈل کا راجہ
شاہ محمد کا تانگہ

یہ باتیں اب راز رہیں گی

یہ باتیں اب راز رہیں گی اِس پتھر کی بستی میں
ہم یاقوت کی آنکھوں والے کب سوئے اور کب جاگے
ریزہ ریزہ نور چنا تھا کس نے خدا کے ماتھے سے
کس نے نور کے دل سے نکالی اُجلی شبنم راتوں کو
شعر کی وادی میں اترے تھے کون پیمبر لفظوں کے
کون چُرا کر لے آتے تھے لعل صحیفوں کے گھر سے
کیوں پھولوں کو روگ لگے تھے پورے چاند کے موسم میں
کیوں رنگوں کی سرگوشی پر سرخ شگوفے روئے تھے
پھیلتی راتوں کے پہلو میں کس کی درد سے باتیں تھیں
ہم کلیوں کے دل والے کب مسکائے کب مرجھائے
یہ باتیں اب راز رہیں گی اِس پتھر کی بستی میں

☆☆☆

ترے مکان کے بام پر

ترے دیار میں خزاں کی فصل بے ثمر
خزاں کی فصل میں سفر، سفر کی رات بے خبر
تمام دیس اجنبی، خموشی ایک اک مکاں
ترے مکاں کے آس پاس رہگذر نہ راہگیر
فقط اداس دو شجر، برہنہ سر ٹھٹھکتے ٹھٹھکتے
شجر، کہ جن کی ٹہنیوں نے کھو دیے ہیں برگ و بار
ہوا کی سرد لہر سے وہ کپکپا کے رہ گئے
اتر رہے ہیں دم بہ دم سفید کہر کے غبار
اسی غبار میں چھپے ترے دیار کے نصیب
مکاں سے دور آسمان، آسماں پہ قمقمے
ٹھٹھرے ٹھٹھرے کے بجھ گئے وہ زرد رُو چراغ بھی
خلا کی دُھندلی برف پر سکڑ کے چاند جم گیا

ترے مکاں کے بام پر دیوں کی ہلکی روشنی
ستا رہی ہے رات کو، بڑھا رہی ہے خامشی
اس مہیب خامشی میں دو قدم دبے دبے
کبھی وہ چل کے رک گئے، کبھی وہ رک کے چل پڑے
وہ چل پڑے تو زندگی کا نور پھیلنے لگا
جو رُک گئے تو تھم گئی ہے نبض کائنات کی

☆☆☆

ریشم بُننا کھیل نہیں

ہم دھرتی کے پہلے کیڑے ہم دھرتی کا پہلا ماس
دل کے لہو سے سانس ملا کی سچا نور بناتے ہیں
اپنا آپ ہی کھاتے ہیں اور ریشم بنتے جاتے ہیں
خواب نگر کی خاموشی اور تنہائی میں پلتے ہیں
صاف مصفّا اُجلا ریشم تاریکی میں بنتے ہیں
کس نے سمجھا کیسے بنے ہیں چاندی کی کرنوں کے تار
کُنجِ جگر سے کھینچ کے لاتے ہیں ہم نور کے ذرّوں کو
شرماتے ہیں دیکھ کے جن کو نیل گگن کے تارے بھی
ہم کو خبر ہے ان کاموں میں جاں کا زیاں ہو جاتا ہے
لیکن فطرت کی مجبوری ہم ریشم کے کیڑوں کی
سچا ریشم بنتے ہیں اور تار لپٹتے جاتے ہیں
آخر گھٹ کے مر جاتے ہیں ریشم کی دیواروں میں
کوئی ریشم بن کے دیکھے ریشم بننا کھیل نہیں

☆☆☆

ڈگڈگی والے

ڈگڈگی والے تری آنکھ میں کالے کنکر
اِک اذیت میں مسلسل تجھے رکھتی ہے چُبھن
ہو گیا جس کے سبب تیرا جہاں گرد و غبار
کھو گیا درد کی راہوں میں کہیں تیرا قرار
دائرہ وار ترے چار طرف بین تری
رقص کرتی ہے کسی شوخ پری کی صورت
جس کی رفتار میں غربت کی نحوست شامل
ایسی منحوس کہ کُوفے کی ہو قطام کوئی
ڈگڈگی تیری ، ترا سانپ ، جمورا تیرا
ایک اک کر کے تری حُکمِ سرا سے باہر
تُو زمیں بوس ہوا ناک نے مٹی چاٹی
تیرا بندر تری گردن پہ اکڑ کر بیٹھا
جس کے ناخن نے بگاڑے تری چہرے کے نقوش
جسم بے جان ہوا دل پہ خراشیں آئیں
ہو گئی صورتِ حالات مخالف تیرے
ڈگڈگی والے تو اب سوچ رہا ہے شائد
اتنا آسان نہیں روز تماشا کرنا

☆☆☆

نفیریاں بجانے والیاں

ہمارے گاؤں آ گئیں نفیریاں بجانے والیاں
نفیریاں بجانے والیوں کے دائیں بائیں رقص میں بشارتیں
تریل کی شراب پی کے، سانجرے کی سُرخیوں کے ملک سے
سوار ہو کے سورجوں کی روشنی پہ آ گئیں نفیریاں بجانے والیاں
ہمارے گاؤں کے خراس والے چوک میں ردو بیریوں کی لاگروں کے سبز سائے
سوندھی سوندھی گاچنی سے لیپی آسنوں پہ آج پھر
چڑھیں ہیں صندلی کنواریاں، نفیریاں بجانے والیاں
نفیریاں بجانے والیوں کے کان کی لوئیں گلاب کی
گلابوں کے کنارے گھومتی ہیں گول گول سی بھنبھیریاں
نفیریاں بجانے والیوں کی کُرتیاں ہلال کی، غرارے نور کے
غراروں کے حصار میں کھنکتی چار چار جھانجریں
سفید جھانجروں کے بیچ کانچ اور پارے کی شریر پنڈلیاں
ہمارے گاؤں کے ہیں سادہ سادہ کاسنی سے گھر
گھروں کے زندہ آنگنوں میں آ گیا نفیریوں کا میٹھا میٹھا شور
بجا رہی ہیں گاؤں کی جوان بالیاں، نفیریوں کے سنگ تالیاں
ہمارے گاؤں آ گئیں نفیریاں بجانے والیاں

☆☆☆

CamScanner

میں چانن کے دیس کا پنکھو

میں چانن کے دیس کا پنکھو اور ماتھے پر لاٹ
سورج ساتھ شریکا میرا، دل تاروں کی ہاٹ
نیل کے منڈل والے پیڑ پہ آہلنے کی دہلیز
کلغی زرد چراغوں کی اور سُرخ عقیقی چونچ
روشن چونچ سے پکڑی میں نے صبح سویر کی شاخ
اک اک بوند جگر کی لے کر باندھے شفق کے تار
گھور اندھیرا جگ نگری میں، کالا سب سنسار
اس نگری کے بیچ مَیں لایا کرنوں کے کچھ ہار

میں چانن کے دیس کا پنکھو، اور پروں میں لَو
میرے آہلنے کی دہلیز پہ قوس کی لمبی راہ
راہ کی پہلی منزل پر ہے چودہ دن کا چاند
میرا بھوجن نور کے ریزے، دھوپ کے اُجلے موتی
مِلک میں میری چاندنی فصلیں اور تاروں کے باغ
مَیں پنکھو، پر لوگ نہ مانیں، مجھ کو کہیں وہ شاعر
کالی شبوں میں کہنے والا چودھویں رُت کے شعر
بیٹھے سُروں میں گاتا ہوں مَیں، سُن کر درد کے گیت
سادہ لوح زمانے والے میرے بن گئے میت

☆☆☆

تریاق میں لہو کی بوندیں

ایک بد بخت سپیرے کی سیہ میّت پر
پھیلتی رات، اُترتے ہوئے سایوں کا ہجوم
جیسے اُجڑی ہوئی بستی میں نحوست کے عذاب
ہر طرف ناچتی پھرتی ہوں جہاں بدروحیں
قرن ہا قرن سے اوڑھے تھیں خباثت کے نقاب
رانڈ جوگن، کہ ہوئی رقص کناں اوّلِ شب
رات کے پچھلے پہر زور سے سینہ پیٹا
ایسے ماتم میں کھڑی تھی کہ غصیلی ناگن
گھر کے پالے ہوئے سانپوں کا کلیجہ کھایا
اور سینے میں بھرا حاسِد بدخُو کا عناد
چیختی ہے تو لرز جاتا ہے وحشت کا بدن
شدّتِ خوف سے تن جاتی ہیں چھاتی کی رگیں
پی گئی زہر جو پیالوں میں بھرا تھا اُس نے
اور ڈسنے لگی آئے ہوئے غم خواروں کو
نیلگوں جسم پہ اُگ آئے پھپھولے لاکھوں
ہر بُنِ مُو سے اُٹھی سانس دھوئیں کی صورت
سُرمئی دھوپ میں پھیلا ہوا بدبو کا غبار
عمر بھر خستہ ستونوں سے لپٹ کر جو پڑے
دریوزہ میں ہیں گرفتار ہزاروں منتر
سڑتی لاشوں کی طرح بکھرے پڑے ہیں گھر میں
سوکھے پیڑوں سے اُتر آئے گِدھوں کے بادل
سخت چونچوں سے اُکھیڑیں گے بدن کے ریشے
وائے خاموش رہے کتنے برس چارہ گراں
آج تریاق میں شامل ہیں لہو کی بوندیں

☆☆☆

CamScanner

چوڑی گلی کے سامنے

چوڑی گلی کے سامنے والے گھر میں ٹھنڈک
ایک طلسمی ٹھنڈک نیم کے پیڑوں کی
سبز پرانی شاخیں پھیلیں دور تلک
اور شاخوں کے رنگ کھلے چوباروں پر
چوباروں کے چھجوں پر سو اُڑیں کبوتر
نیل کی گانی والے گھرے لقے کبوتر

سامنے والے گھر کے سامنے میرا آنگن
میرے آنگن بیچ کھڑی دو ٹاہلیاں اونچی
چیت سمے کا بُور پھُٹا ہے ٹہنیوں پر
اور پتّوں پر کاسنی شیشے چمک رہے ہیں
صبح سویرے جامنی لالیاں آ جاتی ہیں
نیلی رگوں پر ہلکی چونچیں مارنے والی
اُڑ اُڑ کر جا بیٹھیں نیم کی شاخوں پر

نیم کی چوٹیاں بھر گئیں میری ٹاہلیوں سے
لقے کبوتر مل گئے نازک لالیوں سے
سامنے والے گھر سے پر انجان رہا میں
وہ میرا آنگن دیکھ سکا نہ اُس کا میں

☆☆☆

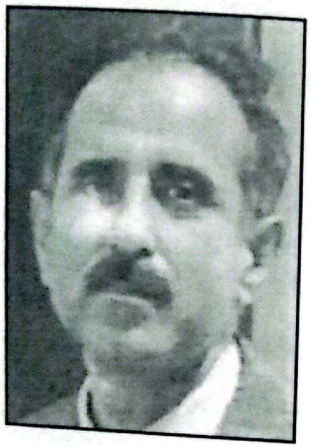

فرخ یار

نام: فرخ یار خان
قلمی نام: فرخ یار
ای میل: farrukh.khan@bop.com.pk
فون نمبر: 0300-9189280

تصانیف: مٹی کا مضمون
نیند جھولتے لوگوں کے لیے لکھی گئی نظمیں
یہ مہ و سال یہ عمریں

چائے خانہ

سنت سادھو نہیں کہ گلہ نہ کریں
جنگلوں میں رہیں
بادلوں پر چلیں
زندگی ہم تیرے
جوڑ جھالے میں گم

عام انسان ہیں / جو پریشان ہیں
زندگی یوں ہمیں بے دلی سے نہ مل
ہم اتر جائیں گے
انت کے روبرو گھرے پاتال میں
ہم بھٹک جائیں گے

دودھیا راستوں
پانیوں سے بھرے بادلوں میں کہیں
سُرمئی خاک کو بُھربُھرا چھوڑ دے
جو مکاں ہے اسے لامکاں نہ بنا
ہم زبانی کا خط بے زباں نہ بنا
تیری تکرار میں تیرے ہم راز ہیں
تیرے عشاق ہیں
تیرے جاں باز ہیں
زندگی یوں ہمیں بے دلی سے نہ مل

☆☆☆

پڑاؤ

محبت وہ ستارہ ہے
جو سطحِ مرتفع پر
خیر کی خبریں سناتا ہے
تو راتیں بھیگ جاتی ہیں
بدن کی سیپیوں میں
خواہشوں کی بوند پڑتی ہے

محبت ایسی ناؤ ہے
جو بے آواز لوگوں سے
نہیں کھنچتی
اسے۔۔۔ ہم کھینچتے ہیں
آبِ گُم کی منزلوں پر
سبز دریاؤں سے
گدلے پانیوں تک
طے کر کے نہیں بُنتے

محبت ایسا رستہ ہے
جو ہم
خود سے نہیں چنتے
کسی نے لکھ دیا اس کو
سو ہم نے چُن لیا اس کو
محبت ایسی چادر ہے
جسے ہم لوگ
کسی نے رکھ دیا اس کو
سو ہم نے
بُن لیا اس کو

☆☆☆

خالی دن تھے

لطف بہت تھا
اُس مٹی پر ننگے پاؤں چلنے میں
جس مٹی کا سینہ
میرے پُرکھوں نے خوابوں کی لو سے
روشن رکھا
جس کی خوشبو
اب بھی میری سطروں
میرے آئینہ خانے میں گھلی ہوئی ہے

میں وہ مٹی
چھو کے جب
سانس لیتا تو
جسم و جاں میں سرشاری کی لہریں
نیل گگن چھونے لگتی تھیں
حرف و معانی کی شاخوں سے
دو دو چاند نظر آتے تھے
لیکن جانے سانجھ نہیں تھی

یا توفیق سے
خالی دن تھے
ویسے تو گھبراہٹ کی
ہر ہر ساعت بر کھائی مجھ سے
لیکن اس مٹی کو گوندھ کے
کوئی مشکل نہیں بن پائی۔۔۔۔
مجھ سے

☆☆☆

(میاں اصغر علی کے لیے)

مجھے کھول تازہ ہوا میں رکھ

یہ جو فصلِ فرقتِ عصر ہے
اسے کاٹ بھی
یہ جو دفترِ غمِ زیست ہے
اسے بند کر
اسے بند کر کہ وہ بہت بت فروش نہیں رہے
جو اسیر تھے رخِ دہر کے

ترے روبرو ترے چار سُو
شبِ ہست و بُود کی راہ میں ترے ہم قدم
ترے آئینوں کی شکستگی کا بھرم لیے
کوئی اور کب ہے مرے سوا
کوئی اور کب تھا مرے بغیر

مگر اے رہینِ دمِ الست
مرے واقعے کے مقدمات سے پیشتر
میری بندگی کو فروغ دے
کبھی دوپہر کے خمار میں
کسی عکسِ موجِ بلا میں رکھ
میرے خاک وخوں کو نہال کر
مجھے کھول تازہ ہوا میں رکھ
☆☆☆

تماشا گاہِ ہستی میں

تماشا گاہِ ہستی میں
جہاں گم پانیوں میں دل دھڑکتے ہیں
ستارے جھلملاتے ہیں
تڑپتی ہیں کٹ کتے بازوؤں میں مچھلیاں لیکن
جبینوں پر لکھی تحریر پڑھتے
ہم مکاں سے لامکاں تک آن پہنچے ہیں

تماشا گاہِ ہستی میں
جہاں دستِ کشیدہ کار ہے
لاکھوں پرندوں کی اڑانیں ہیں
زمیں ناراض ہے
لیکن زمیں کا ذکر ہے سطرِ معطر تک

خمارِ ابر ہے!
کچھ دھوپ ہے
اِک پردۂ افلاک ہے
جس پردۂ افلاک کو کل تک سرکنا ہے

تماشا گاہِ ہستی میں مجھے کب تک ٹھہرنا ہے
☆☆☆

CamScanner

ہفت شماری کے میزان پہ

ہم اثبات کے نیلے خیمے
اور پُرکھوں کے شب خانوں میں
سانسیں لیتے لیتے
اُس منزل پر پہنچ گئے ہیں
جس سے آگے
ہفت شماری کے میزان پہ جیون رُکا ہوا ہے
لیکن عمریں بھاگ رہی ہیں

رستہ چاہے مٹی کا ہو
جنگل کا یا پانی کا
ہم تیری دنیا تک آنا چاہتے ہیں
تجھے فصیلِ زماں میں
پوروں، آنکھوں اور ہونٹوں سے
جتنا بھی محسوس کیا ہے کم ہے
تیز ہوا کے رنگ
کئی برفیلے موسم
جسموں کے بے ربط تماشے
جن کی کوکھ سے خوابوں اور حرفوں نے
دھیرے دھیرے جنم لیا

ہم نے بس درزوں سے دیکھے
ہم اُس چشمے پر کب ٹھہرے
جو تیری ایڑی سے نکلا
اور ابد تک پھیل گیا
دیکھ ہماری جانب دیکھ کہ ہم
خوابوں اور حرفوں کی تکرار سے پہلے
پتھر، کانسی اور لوہے کے فرش سے اُٹھ کر
حسن اپنے منصب تک لانا چاہتے ہیں
رستہ چاہے مٹی کا ہو
جنگل کا یا پانی کا،
ہم تیری دنیا تک آنا چاہتے ہیں

☆☆☆

ہم تو بس.....

ہم تو بس پیشی بھگتانے آئے ہیں
ہم نے کیا لینا دینا ہے
رقصِ صبا سے
تم سے
اس میلے سے
جس میلے سے
دستاویز پہ دستخطوں کی پہلی فصل بچھی تھی
اور زمانہ دو فرسنگ کی ناہموار مسافت پر حیران کھڑا تھا

ہم نے کیا لینا دینا ہے
چاند سے
چاند کی بڑھیا/اور اُس کے چرخے سے
اس آنسو سے
جو ٹپکا تو ہجر ہماری عمروں کے حلقے میں
اوّل اوّل نقش ہوا
دل دریا کی لہریں اور کچہری کا دروازہ
کب ہستی پر زینہ زینہ میلی آنکھوں کی سیرابی

کب دنیا کی بھیڑ میں سانسیں لیتا وعدہ
یاد دلانے آئے ہیں
ہم تو بس پیشی بھگتانے آئے ہیں

CamScanner

مجھے بس یہی کہنا ہے

نہ وہ وصل آخری وصل تھا
کہ جہانِ رنگ و خمار میں
کوئی تازہ باب ہی کھولتے
نہ یہ ہجر آخری ہجر ہے
کہ بدن کے گرم مزاج کو
کسی برف رُت سے ہی تولتے

مرے مرکزے سے محیط تک
کئی سلسلے ہیں غبار کے
جنھیں کاٹنے کا ہدف لیے
کئی زاویے کئی موڑ ہیں
خطِ استوا کی تلاش میں

یہ جو خوف ہے
مری گفتگو، مری خامشی میں بھرا ہوا
یہ جو گرد ہے مہ و سال کی
مرے خاک داں پہ جمی ہوئی
اسے کون لایا شمار میں
اسے کون لائے شمار میں
کہ جہانِ رنگ و خمار میں

نہ وہ وصل آخری وصل تھا
نہ یہ ہجر آخری ہجر ہے

☆☆☆

شاید ایسا نہ ہو

ہے کوئی حجرۂ بے نام میں رُکنے والا
آنکھ جس شخص کو اشکوں سے پذیرائی دے
دل جسے بابِ تسلسل میں نمایاں کردے
خوابِ ہستی پسِ دیوار پریشاں نہ رہے
اور اقرار کی ساعت میں کھلے نیلے فلک کا جادو
ہے کوئی عمر کے صحرا میں کڑی دھوپ چُنی ہو جس نے
حوصلے جس کی نگاہوں سے فروزاں ٹھہریں
جس کی آواز سے سرشار ہو
گم گشتہ زمانوں کا ہجوم
زندگی ضعفِ مہ و سال میں جس چہرے کو
حیرتیں باندھ کے
رُک رُک کے پلٹ کر دیکھے

دیکھ اس موڑ پہ
جس موڑ پہ میں زندہ ہوں
دیکھ اس عہد میں
جو عہدِ کرم خو بھی نہیں
عین ممکن تھا کہ وہ تو ہو
مگر تو بھی نہیں

☆☆☆

حاشیے پر پھیلتی بے چینی

میں نے اُس کو اتنا دیکھا
دو آنکھوں سے جتنا دیکھا جا سکتا ہے
پھر بھی آخر
دو آنکھوں سے کتنا دیکھا جا سکتا ہے

☆☆☆

فہیم شناس کاظمی

نام: ڈاکٹر سید فہیم اقبال
قلمی نام: فہیم شناس کاظمی
ای میل: faheemshanas@yahoo.com
فون نمبر: 0333-3359155

تصانیف: سارا جہاں آئینہ ہے
خواب سے باہر
راہداری میں گونجتی نظم
سندھ کی آواز (جی ایم سید کے عدالتی بیان کا ترجمہ)

CamScanner

آگ معبد سے نکل آئی ہے

آگ
معبد سے
خداوند کے زنداں سے سرِ شام نکل آئی ہے
اب صنم ہو کہ علم اور حرم
کوئی نہیں بچ سکتا
شاخ در شاخ چلے
شہر در شہر بڑھے
سبز پیڑوں کو
کھلونوں کو
پرندوں کو جلاتی ہوئی آگ
لہر در لہر بڑھے
وہ ہو بغداد کہ تہران کہ روم
کوئی نہیں بچ سکتا
اے مرے کوزہ گر!
نرم و نازک تیرے کوزے بھی
نہ جل جائیں کہیں
اور دامن بھی سلامت نہ رہے
کوئی افسانہ بھی باقی نہ رہے

آگ شوریدہ و سفاک......
......بہت ہی سرکش
دیوتاؤں سے چُرائی ہوئی آگ
کسی سیلاب کی مانند
اپنے معبد سے نکل آئی ہے
رقص کرتی ہوئی
اور سانپ سی لہراتی ہوئی
شمس تبریز و قلندر بھی نہیں
آگ سے کون لڑے
کون کہے
راکھ ہونے کے لیے کچھ بھی نہیں

☆☆☆

صبر کی چادر تہہ کر دی

اب ہم نے پیالہ اُلٹ دیا
کوئی آگ پیئے کہ زہر پیئے
یا سانپ ڈسے کی موت مرے
اب دھوپ کے جل تھل دریا سے
کوئی اپنے مُنہ میں ریت بھرے
ہم نے تو پیالہ اُلٹ دیا
اور اُلٹ دیا
ہر اک منظر
کہ شام سے آنکھیں خون ہوئیں
اور بوڈلہ بوٹی بوٹی تھا کسی رستے پر
یہ بستی ظلم کی ظلمت میں
تب کچی دھوپ چباتی تھی
اور دریا پیتی جاتی تھی
سو ہم نے اُلٹ دیا منظر
اب رات سے رات نکالی ہے
اور راکھ میں راکھ ملا دی ہے
اب پھانکو ریت اور دھوپ پیو
یا سانپ ڈسے کی موت مرو

ہم نے تو پیالہ اُلٹ دیا
اور صبر کی چادر تہہ کر دی
مسواک زمین میں گاڑ دی ہے تلواروں سی
اور آگ میں ڈالی مست دھمال
اب خیر کی ختم ہوئی اُمید
اور ہم نے پیالہ اُلٹ دیا

☆☆☆

زوال

مکڑی
اک نقطے سے
کام شروع کرتی ہے
سُندر.....اُجلا.....دلکش
وہ نقطے کے چار طرف ریشمی جالا بنتی ہے
پھر مہکے اُجلے سارے حرف
ساری زباں کھا جاتی ہے
مکڑی زباں کو کھا کے
لبوں کے در پہ جالا بنتی ہے
پھر گھر پہ جالا بنتی ہے
پھر شہر پہ جالا بنتی ہے
پھر تہذیبیں کھا جاتی ہے
پھر.....

☆☆☆

CamScanner

مائے ہم کو کون بتائے

مائے ہم کو کون بتائے
کل جانے کیا ہونا ہے
تو نے جتنے خواب دکھائے
کب ان کو سچ ہونا ہے

سورج جیسے جلتے دن
عمروں سے لمبی راتیں
چُور تھکن سے اپنے بدن
سوچوں سے لمبی راہیں

مائے اب تو ہر رستے پر
اِک زہریلا سایہ ہے
کوئی نہیں ہے اپنا پرایا
بس اک رشتہ مایا ہے

مائے ہم کو رات ڈرائے
مائے کو ہم نیند نہ آئے
مائے ہم کو کون بچائے

☆☆☆

شعور

خواب ہے چاند
اور میں ہوں چکور
چاندنی شب میں
جس کو وحشت میں
پاگلوں کی طرح محبت میں
پانے نکلا تو جان ہار گیا

یہ جنوں ہر کسی کو ہوتا ہے

☆☆☆

اور خدا خاموش تھا

ایک بوسے کی طلب میں
جسم کبڑے ہو گئے
زندگی پانی ہوئی
آسماں سے کہکشاؤں کی بہار
آگ برساتی رہی
زندگی فٹ پاتھ پر
ایک روٹی کی طلب میں
ہاتھ پھیلاتی رہی
قطرہ قطرہ بے بسی تیزاب سی
جسم پگھلاتی رہی
ردّی چنواتی رہی
نیٹی جیٹی پر کھڑی خلقِ خدا
ہنستی رہی
اور خدا خاموش تھا

☆☆☆

ہمارے شجرے بکھر گئے ہیں

گماں کی بے رنگ ساعتوں میں
نواحِ کرب و بلا سے دربارِ شام تک ہم
لہو کی اک ایک بوند کا سب خراج دے کر
تمام قرضے چُکاتے آئے
شکستہ دہلیز
لہو کی محراب
سناں کا منبر
ہماری عزّت بڑھاتے آئے
کہ ہم نے انساں کو
وہ ہم ہی تھے جو قیام کرتے
چھاؤں دیتے
رکوع میں جھکتے
گھنیرے پیڑوں پہ خون چھڑکا
زکواۃ دے کر
جُھلستے صحرا کو تازگی دی
خود اپنے حصے کا طعام دے کر
دہکتی دھرتی کو زندگی دی
دُرود و صلوات پڑھتے آئے
مگر وہ تسکیں کا پل کہاں ہے
وہ ہم تھے جو گھروں سے نکلے
بھنور بھنور ہے زمانہ سارا
تو پھر ابد تک..... پلٹ کے گھر کی طرف نہ دیکھا
وجود اپنے کدھر گئے ہیں
ستارۂ سحری گواہ ہے
ہمارے شجرے بکھر گئے ہیں.....

☆☆☆

خوش نما زندگی کی سرحد پر

شام کے کنارے پر
خوش نُما ستارہ ہے
زندگی کے دریا میں
کیا عجیب دھارا ہے

راستوں میں خوشبو سی
دل ہے لہر میں جیسے
کیا نئے سے منظر ہیں
اپنے شہر میں جیسے

اس خراب خانے میں
کس کو ہم صدا دیتے
سوچتے رہے ہم تو
کیا تمھیں بُھلا دیتے

آندھیوں کے موسم میں
ہم چراغ لائے ہیں
وقت نے پکارا ہے
ہم ایاغ لائے ہیں

☆☆☆

خوش نُما ستارہ بھی
رات کا اشارہ ہے
شام کے کنارے پر
خوش نُما ستارہ ہے

CamScanner

ایک خواجہ سرا کا نوحہ

اے دیکھیو......
یہ کون سا لمحہ گزر گیا......؟
یہ کیا ہوا......؟
لرزنے لگے گھر کے بام و در
یہ کیا ہوا کہ گرد اڑی دور دور تک
کیوں آنکھ آنکھ خون سے لبریز ہو گئی
وحشی ہوا میں اُڑتی ہیں شیشے کی کرچیاں
اور دھوپ ہاتھ آنکھوں پہ رکھ کر ہے چیختی
چیلیں ہیں۔ آسمان ہے۔ آنکھیں ہیں
اور یہ دل
اور کالی بلی کاٹ گئی راستہ مرا
اور شام راستے میں سکھاتی ہے اپنے بال
خوابوں کے ابر برسے نہیں تپتی نیند پر
اور کتنی تشنہ آنکھیں یہاں خاک ہو گئیں
خود سے گریز کیجیو۔ ہرگز نہ سوچیو
یہ سوچ ہی دماغ کا ناسور ہو وے ہے
دل ہے گلاب۔ اس کو نہ پتھر پہ توڑیو
سوسن، بہار، نرگس و چمپا، سبھیں پہ تھیں
کس باغ کو گئیں......؟

اور دھوپ کتنی ڈھل چکی دیوارِ شام سے
اور خواب گاہ میں نہیں...... اب تک جلا چراغ
ہر سمت گہری شام رچاتی ہے راس اور
شامِ اودھ میں صبحِ بنارس بھی کھو گئی
اور روشنی میں روشنی باقی نہیں رہی
اے دوڑیو......
زمانے کی بدلی ہے کیسی چال......؟
اے دیکھیو......
یہ شہر میں بھونچال آ گیا......؟
اے دیکھیو......
ستارہ و عذرا و خوش جمال
ادھر دیکھیو......
ہر سمت ایسا گھور اندھیرا ہوا ہے کیوں
اے دیکھیو......
یہ آنکھ کیوں پتھرا گئی مری

☆☆☆

ناہید قمر

نام: ناہید قمر
ای میل: naheedurdu30@gmail.com
فون نمبر: 0300-5309983
تصانیف: اک سفر اداسی کا
اُردو فکشن میں وقت کا تصور (تحقیقی مقالہ)
اُردو ادب میں تاریخیت
زندگی کے حاشیے پر (نظمیں)

رات خاموش ہے

رات خاموش ہے
بولتی کچھ نہیں
کن فراموشیوں کے کناروں سے یہ
ایسے ادھڑے ہوئے
دل زدہ منظروں کو اٹھا لائی ہے
جو رفوگر کے ہاتھوں میں آتے نہیں

بال و پر فاختاؤں کے جھلسے ہوئے
راکھ اُڑتی ہوئی
کیسے پوچھے مگر اُن دریدہ زمینوں
کی بابت کوئی
شاخِ زیتون سے

کرگسوں نے جہاں
عہدِ نسیان کی بے کفن ساعتوں کے بدن ہی نہیں
بابِ وابستگی کے
سنہری غلافوں میں لپٹی ہوئی یاد کے
برگزیدہ ورق کھا لیے
رہ گیا ایک پنجر سا تابوت میں
وقت کی منجمد کروٹوں کا نشاں
داستاں کے سرے
ایک بے واقعہ واقعیت کے دھاگوں میں
الجھے ہوئے
رہ گئی ہے فضا میں فقط گونج سی
گورکن کی کدالوں کی آواز کی
اور حرفِ مکافات خاموش ہے
رات خاموش ہے

☆☆☆

موہوم کی ان سلی نیند میں

چھان کر دیکھ لی
ریگِ دشتِ زیاں
ڈھونڈ پائے نہ ہم دوسرا آسماں
اجنبی موسموں کی اڑانوں میں
ٹوٹے پروں کی طرح
ہم جیے بھی تو کیا
کس نے دیکھا ہمیں
چشمِ نم کے کناروں پہ
ٹھہرے ہوئے منظروں کی طرح
رات کی آنکھ سے
بہ گئے خواب بھی، ہم بھی
موہوم کی ان سلی نیند میں
یاد کے طاق میں
اب تمنا کی لَو کا نشاں تک نہیں
واہمہ سا ہے بس
کوئی آہٹ تھی ہمراہ یا کچھ نہ تھا
خوابِ ہستی ہمیں
اک اذیت بھرے دامِ معدومیت کے سوا
کچھ نہ تھا

☆☆☆

ہَوا جانتی ہے

نار کو نور،
تعصّب کو مساوات لکھو
عہدِ ابلیس کو آدم کی فتوحات لکھو
خودکشی قتل کو
چیخوں کو مناجات لکھو
لبِ گویا کی جزا سلسلۂ طوق لکھو
جھوٹ لکھنا ہے مؤرخ، تو بصد شوق لکھو

گرگِ شب زاد کے حیلوں کو یہ پہچانتی ہے،
حاشیۂ متن میں کتنا ہے، ہوا جانتی ہے
وقت اقلیم تھا جن کی
وہ سبکسار ہوئے
جانے کس نیند کے ہنگام سے دوچار ہوئے
اب جو کروٹ پہ زمانے کی پڑے جلتے ہیں
حُرمتِ درد کے رشتے میں پروئے ہوئے لوگ
زخمِ ادراک کا سرمایہ لیے چلتے ہیں
جن کا منصب نہ ٹھکانہ،
نہ نسب ہے کوئی
جن کے چہرے ہیں تو تاریخ کے گم گشتہ ورق

سدرۃ العشق کی پُر پیچ مسافت میں جنھیں
یاد بھی ایک سی تہمت ہے، فراموشی بھی
(زندگی اہلِ تاسف پہ ہی موقوف نہیں)
مرگ بر شاہ
پر کاہ سے بدتر ہیں ترے جاہ و حشم
شہر پانی پہ کھڑا ہے، سو بہے جاتا ہے
چشمِ خونناب کا گریہ جو کہیں پر ٹھہرے
دھوپ دیوار پہ، دیوارزمیں پر ٹھہرے

بابِ احسان کُھلے، بیعتِ رضوان کُھلے
چشمۂ خضر عبث، تختِ سلیماں بے سود
کعبۂ دل کی روایات میں "تحویل" بھی ہے
مسلکِ صبر کی میزان پہ تُلنے والو
فتنۂ یاس فروشاں سے نہ ہارو
کہ ابھی آتش و فیل کے قصے میں
ابابیل بھی ہے

☆☆☆

آئینے سوالوں کے

کیوں آسمان بھر سے
حصے میں اپنے آئے
آدھے ادھورے منظر
کیوں آنکھ کو ملی ہیں
ٹوٹی ہوئی لکیریں
اک دستِ آرزو پر

دل نے کفِ گماں سے
اک نظمِ گم شدہ کی
سطریں تو ڈھونڈ لی ہیں
پر جھڑ چکیں لبوں سے
سوکھی ہوئی دعائیں
اور چشمِ خامشی میں
اک اَن کہی کا شیشہ
دھیرے سے چھو گیا ہے

حاصل کے آئینوں میں
اک سانس بھر گھڑی کے
معکوس زاویوں پر
معدوم ہو رہا ہے
عکسِ رخِ تعلق
متروک راستوں کی
ویرانیاں پہن کر
ہم کر سکیں گے کب تک
نادیدہ کا تعاقب

☆☆☆

آبی رنگوں سے بنے منظر

اس فراموش دنیا کا خاکہ سا ہے
یاد کی سبز جھیلوں سے آگے کہیں
بے ٹھکانہ دنوں
اجلی پیشانیوں
جھلملاتی شبوں
دل کی حیرانیوں سے
کوئی عکس لیکن ابھرتا نہیں

نیند کے اس طرف
رات کے اُس طرف
کچھ بھی یکجا نہیں
ہم
کہ بے آسماں تھے
ہمارے لیے
زندگی آبی رنگوں کی تصویر تھی
بارشوں نے کوئی نقش چھوڑا نہیں

ان پریشاں لکیروں پہ
اب دھوپ اترے تو معلوم ہو
خواب کی بستیوں سے نکالے ہوئے وہ پرندے
کہ جن پر زمیں تنگ تھی
ان کے ٹوٹے پروں پر لکھا ماجرا
اب کوئی داستاں گو سناتا نہیں
راستوں پہ اگر گھاس اگ آئے تو
دل کو سیال کرے بھی
بکھرے ہوئے منظروں کو
کوئی جوڑ پاتا نہیں

☆☆☆

خواب بہ جاتے ہیں

ہم اگر وقت کی اُس رو کا سراپا سکتے
جس میں بہتی ہوئی مل جائے
کسی یاد کی آسودہ مہک
جس میں دن رات کے آزار کا چارہ مل جائے
خوابِ موجود کے رفتہ کا
کنارہ مل جائے

اُس کنارے سے
ترے عکس کی لو تھام کے ہم
کسی امکان کے معلوم تلک جا سکتے
ہم مگر کچھ بھی نہیں
ذات کے وہم کا آشوب ہیں ہم
گیلی مٹی ہیں نہ وہ چوب ہیں ہم
جس سے اک خواب کی صورت
یا صدا پھوٹ سکے
تار آنسو کا کہیں ٹوٹ سکے

خاک جب خاک میں ملتی ہے
تو کب کھلتا ہے
کس کے قدموں کے نشاں ثبت ہیں

پہچان کی پگڈنڈی پر
دل میں اب کون سی قبروں پہ
دیے جلتے ہیں
تجھ سے ملتے ہیں
تو پل بھر کے لیے
زخم اک بھرتا ہے
اک سانس ادھڑ جاتی ہے
چشمِ نمناک پہ
ٹھہرے ہوئے منظر لے کر
یاد کے
نیند کے معدوم کناروں کی طرف
خواب بہ جاتے ہیں
اور رات گزر جاتی ہے

☆☆☆

رقصِ فنا کی لہر

آنسو، ریت، سفر، ویرانی
خواب، محبت، دریا، دھوپ
لمحہ لمحہ، ٹکڑا ٹکڑا
کتنی عمریں جوڑنا ہوں گی
بے چہرہ مٹی میں
کب تک گھومے گا یہ چاک
دل کی بنجر تاریکی میں
اک مٹھی بھر جگنو بو کر
سورج کون اگا پایا ہے
انہونی سفاک
آنکھوں کے بوسیدہ کاغذ
لفظوں کی گرہوں سے جوڑیں
سانس میں ٹھہری چپ سے اٹھا کر
ٹوٹ چکی آواز

تن پر جلتا کانچ لپیٹے
درد کے ٹھنڈے انگاروں پر
رقصِ فنا کی لہر میں دنیا
راز ہے یا ہم راز

ساحل، شام، اداسی، یادیں
کچا لمس تنور
روح کے اجلے ایندھن پر
نادیدہ سگ مامور
صحرا، پانی، پیاس، پرندے
سائے بے تصویر
کس تقویم کا حصہ ہوگی
وقت کی اک کترن پر لکھی
بے معنی تحریر

☆☆☆

زندگی دائروں میں چلتی ہے

دل کے نقطے سے درد کی قوسیں
ضبط کے، گردِ بادِ حیرت کے
ہجر کی وصل ساز وحشت کے
ان گنت زاویے بناتی ہیں

زخمِ گریہ کی ستر پوشی کو
گم شدہ گھر کے استعارے کا
اور اک ہم سفر ستارے کا
آسماں بُن لیا ہے آنکھوں نے

معبدِ جاں کی سرد چوکھٹ پر
آگہی کا ہزار پا عفریت
سانس کی آہٹیں نگلتا ہے
روشنی، زندگی، یقیں، رشتے
سب ہیں ایندھن، زیاں کے دوزخ کا

قربِ موہوم کا دھندلکا ہے
ایک منظر نظر سے ہٹتے ہی
خود کو ہم کب دکھائی دیتے ہیں
فاصلہ بھی گماں کا دھوکا ہے

بے سخن موسموں کی مٹی میں
آئینے کی سرشت در آئی
سوچ، آواز، روح، خاموشی
سب کے چہرے ہوا بناتی ہے
ریت ہوتے ہوئے زمانوں کو
یاد کے مرکزے پہ لاتی ہے

زندگی دائروں میں چلتی ہے
اور سب دائرے ادھورے ہیں

☆☆☆

زمینیں بارشوں کا زخم ہیں

منادی ہو!
جہانِ منتظر کو، کشتگانِ صبر کو
اہلِ تماشا کو
منادی ہو!
جلادیں گھر کے دروازوں پہ
چسپاں تعزیت نامے
نقوشِ پا مٹادیں،
چوکھٹوں سے خون دھوڈالیں
صفِ ماتم لپیٹیں
اور دعائیں سینت کر رکھیں
سلے ہونٹوں سے
ساکت پتلیوں سے
آسمانوں سے،
جنازہ گاہ سے
مقتل سے
اور ٹوٹی کمانوں سے
گواہی مانگی جائے گی

گواہی مانگی جائے گی
رجز پڑھتی ہوا نے کس کے ماتھے پر
نوشتہ فتح کا لکھا، سرِ میدان
لیکن فتح کے آثار کس کے تھے
کہ لشکر میں سپاہی حاشیہ بردار کس کے تھے
جلے خیموں کی اڑتی راکھ سے
بجھتے چراغوں سے
گواہی مانگی جائے گی
گواہی کی مگر ارض و سما میں تاب ہے کس کو
پسِ افلاک، چپ ہے عدل کی میزان
یہ چُپ بھی غنیمت ہے
ہزیمت حافظے کی لوح سے
کھر چا ہوا دن ہے
سو دن کی دھوپ دیواروں سے اتری--

سہ پہر
جنگل کا الجھا ووں بھرا رستہ
زمینیں بارشوں کا زخم ہیں
اور زخم کا رِسنا ہی خاموشی کی قیمت ہے
منادی ہو!

☆☆☆

اِک سفر اُداسی کا

بے نام سے حیرت میں گم
تری نظر کو کیا خبر
تو ہی مرے آئینۂ احساس کی دہلیز پر
اک عمر سے ٹھہرے ہوئے
اس عکس کی تجسیم ہے
جس کے تعاقب میں
مرے سب خواب صحرا ہو گئے

سکھ کی پہلی آنکھ نے
صدیاں ہوئیں بوجھی نہیں
دل نے جیا ہے موت کو
اور زندگی چکھی نہیں

مرے مدارِ زیست میں
لا حاصلی کا مرکزہ
تو ہی تھا تجھ سے قبل بھی
اس رنج کی چپ میں مگر موجود تھا
ترے نہ ہونے کا یقیں

اب تو ملا تو درد کو گویائی کی صورت ملی
اور شیشۂ اِدراک میں
سوئے ہوئے منظر کا چہرہ ڈھل گیا
کیوں تیرہ و تاریک رستوں میں
کوئی تارا کوئی جگنو نہیں
کیوں ہاتھ کی ریکھاؤں میں
خوشبو تری ہے، تُو نہیں
کیسے کہوں کہ دکھ مجھے
کس زخم کے چھلنے کا ہے
تیرے نہ ملنے کا نہیں
دکھ تو ترے ملنے کا ہے

☆☆☆

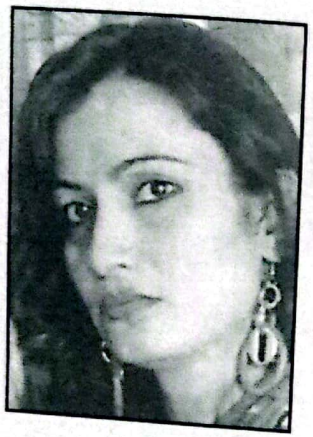

نینا عادل

نام: حمیرا جمیل
قلمی نام: نینا عادل
ای میل: naina.ntpa@gmail.com
فون نمبر: 0334-3416676

نطشے کا مغرب جانتا ہے

شام ڈھلے جن آجاتے ہیں ایک کنواری لڑکی پر
پھر تنگ نائے میں دیر تلک لوبان کی خوشبو اٹھتی ہے
درگاہوں کی قبروں سے اٹھتا ہے اگر بتّی کا دھواں
سلگے ہوئے سگریٹ بجھتے ہیں جلتے ہوئے ذہنوں کے اندر
چشمہ رکھا ہے سستا سا کچھ جنسی کتابوں کے اوپر
نالی کے گندے پانی پر منڈلاتے رہتے ہیں مچھر
اور چونٹیاں چنگیری کی باسی روٹی پر اک لائن میں
طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھائے سیدھ میں چلتی جاتی ہیں
ساڑھی کے میلے پلّو سے ناداری کی بو اٹھتی ہے
آنکھوں کے گدلے گنگا میں اک آس کا دیپک جلتا ہے
اور خوف کی بے رنگ چابی سے معبد کا تالا کھلتا ہے
نطشے کا مغرب جانتا ہے
(دھن کن فقراء میں بٹتا ہے)
مشرق کا خدا کیوں زندہ ہے

☆☆☆

گیت

شہد ہے وقت کے نقرئی جار میں
ذائقہ دار ہے رات کی امرتی
فصل گندم کی تیار ہے!

بھوک ہے
من کی وحشی دِواروں سے چمٹی ہوئی زرد رُو اشتہا!
سبز ہونے کو بے تاب ہے! بے طرح
سر پٹکتی ہے سانسوں میں پیاسی ہوا
آؤ نا، آؤ نا، آؤ نا، آؤ نا
لاؤ نا اِن جویں خلوتِ خاص میں
خواب کی سُرخ مئے اور چھلکاؤ نا
آؤ نا!
آس کے باغ میں ناچتا ہے مگن مور آواز کا
دھن دھنا دھن دھنا، دھن دھنا دھن دھنا
آؤ نا، آؤ نا
کتنی منہ زور ہے چاہ تکمیل کی
چاٹتی ہے لہو بے طرح تشنگی
اس دھند لکے میں لپٹا ہوا اک یقیں!
اک گماں!!

نظم ہو؟ گیت ہو؟ جوئے تخلیق ہو؟
تلخ لذت میں ڈوبا ہوا حرف ہو؟
جو بھی ہو!!!
پاٹتا ہے تمھیں ایک اندھا خلا
آؤ نا.... آؤ نا.... آؤ نا
آؤ نا!!!....

☆☆☆

نظم

رستے میں پڑے روڑے پتھر
پہرہ دیتے وردی والے
دور سے آتا شور شرابا
نکڑ پہ پڑی خالی بوتل
کار کے نیچے سوتا کتا
اور غبار اُڑاتی ہوائیں
سب کچھ اچھا لگتا ہے
جب چلنے کی آزادی ہو!

☆☆☆

اپریل بہار کا استقبال کرتا ہے

فروغِ شادابیٔ چمن کو مہکتی مٹی سے پھوٹ نکلا ہے نرم سبزہ
حریصِ تخلیق نم زمیں نے گلوں سے دامن اداس بیلوں کے بھر دیے ہیں
عجیب رت ہے! کہ بوڑھی شاخوں میں سانس لیتا ہے سبز جوبن
خیالوں، خوابوں کی رہگزر پر چٹک رہی ہیں ہزار کلیاں
نگاہِ دل کے گزیدہ گوشے رہینِ نکہت
فضا کی پوروں میں جاگ اٹھی ہے بھینی خوشبو، ہوا کے ہاتھوں میں روشنی کے جڑاؤ کنگن
ہوا کے پیروں میں رقص کرنے لگے ہیں گھنگرو
پرندے رنگین شام اوڑھے شفق کی سرخی سے کھیلتے ہیں
دمکتے پانی میں غسل کرتے ہیں چاند تارے
نہاتی کلیوں کی بے لباسی کو کتنی حیرت سے دیکھتا ہے
نفیس پتوں کی شال اوڑھے گھنیرا جنگل
گلاب کے سرخ پیرہن پر، سفید پھولوں کی پتیوں پر!
سماعتِ شب میں ثبت کرتی ہے اوس یوں جلترنگ نغمے
کہ گیت وہ جو ازل سے بے کل فضا میں گم تھے
اترنے لگتے ہیں دھڑکنوں کی حسین لے پر، محبتوں کے امین بن کر
ملن کی ایسی صبیح رت میں حسن دیتا ہے آپ دستک
تمھارے در پر...

☆☆☆

عشق

dedicated to the amazing lady Emily Bronte

ہوا ہوا ایملی (Emily) تم اور!
ہواؤں کو تو ساری داستاں معلوم ہوتی ہے
وہ مٹی خاص ہوتی ہے کہ جس پہ عشق کی بارش برستی...
جذب ہوتی ہے
جہاں بے داغ سبزہ پھوٹتا ہے نرم،
پاکیزہ
جہاں پر آرزو کی باوضو کلیاں چٹکتی ہیں
ہوا تو چھو کے خوشبو کا بدن محسوس کرتی ہے
ہوا کا لمس تو گم گشتہ جو ہر ڈھونڈ لیتی ہے
مقدس عشق کی مٹی! ستودہ اور
خوابیدہ
کسی کا رنگ جب اپنی تہوں میں گھول لیتی ہے
چھڑایا جا نہیں سکتا، مٹایا جا نہیں جا سکتا
ہوا ہو جانتی ہو تم یہ ساری رنگ آمیزی
یہ مٹی اک دفعہ منسوب ہو جائے کسی سے گر
تو بیچی جا نہیں سکتی، خریدی جا نہیں سکتی
حضورِ عشق میں رکھ کر قدم دل سیکھ لیتا ہے
سرِ تسلیم خم کرنا
یہاں اک پل کی غفلت، اک ذرا سی جنبشِ ابرو
بھید میرے تم
ہوا ہو جانتی ہو میری فطرت
غرض کا بیج اس مٹی میں بویا جا نہیں سکتا
زمینوں آسمانوں میں دراڑیں ڈال دیتی ہے

فسونِ خواب

بہ رنگِ کیف و سرشاری حدیثِ دل کہو ہمدم!
ہمہ تن گوش ہے ساعت
شرابِ شب اترتی ہے، بہت آہستہ آہستہ
سفالِ خواب میں مدھم
تمھیں اس پل اجازت ہے
کہو! یوں خلوتِ جاں میں
بلوریں چوڑیاں چھن چھن چھنکتی شور کرتی ہیں
مرا دل ڈول جاتا ہے
وفورِ حسن میں لپٹی تمھاری عنبریں زلفیں...
دھڑکنا بھول جاتا ہے
کہو! کاجل سیہ کاجل دھنک رنگوں کا میلہ ہے
کہو! پوریں خیالوں کی
سنہری جلد میں جلتے دیوں پر رقص کرتی ہیں
صراحی دار گردن پر دمکتی نقرئی مالا...
تمھارے کان کی بالی... یہ جادوگر!
یہ عشوہ گر
طلب کی بے زبانی کو عطا کرتے ہیں گویائی
تمھیں اس پل اجازت ہے
کہو، یوں بھید کے جیسے
سرِ کنارات کا آنچل ہوا میں سرسراتا ہے

ستارا شوق کا میری نظر میں جھلملاتا ہے
کہو! کہ موسمِ گل ہے،
گلابوں کی قطاروں میں دمکتے شبنمی لمحے
تمھارے لمس کے پیاسے
بہر موجِ نفس ٹھہرا
سکوتِ شوق کا موسم تمھیں آواز دیتا ہے
تمنا گیت کی صورت لبوں پر گنگناتی ہے
محبت بے محابا ایک لمحے کو ترستی ہے
تمنا بے خبر! غافل...
فسونِ خواب کی مدت بہت تھوڑی بہت کم ہے

نظم "کھیل جاری رہے"

بے جھجک، بے خطر
بے دھڑک وار کر
میری گردن اُڑا
اور خوں سے مرے کامیابی کے اپنے نئے جام بھر
چھین لے حسن و خوبی، انا، دلکشی
میرے لفظوں میں لپٹا ہوا مال و زر
میری پوروں سے بہتی ہوئی روشنی
میرے ماتھے پہ لکھے ہوئے سب ہنر
تجھ سے شکوہ نہیں
اے عدو میرے میں تیری ہمدرد ہوں
تیری بے چہرگی مجھ کو بھاتی نہیں
تجھ سے کیسے کہوں!!!
تجھ سے کیسے کہوں! قتل کرنا مجھے تیرے بس میں نہیں
(اور ہو بھی اگر، تیری کم مائیگی مداوا نہیں)
ہاں مگر تیری دل جوئی کے واسطے
میری گردن پہ یوں تیرا خنجر رہے
(تیری دانست میں)
کھیل جاری رہے

☆☆☆

تکمیل

"تمھیں ثابت کرنا ہوگا کہ تم ہو"! اس نے مجھے جھنجوڑا

"مگر میں یہ ثابت نہیں کرسکتی" میں نے احتجاج کیا

اُس نے مجھے مٹھی میں بھر کر زمیں پر بکھیر دیا اور خوشی سے چلایا! "تم سبزہ ہی سبزہ ہو، رنگ ہی رنگ"

"ٹھہرو ذرا سوچو! مجھے جلد خزاں کے نادیدہ ہاتھ معدوم کردیں گے...... تم یہ ثابت نہیں کرسکو گے کہ میں ہوں"

اس نے گھبرا کر مجھے پھر سمیٹ لیا اور ذرا توقف کے بعد فضا میں اچھال دیا اور پر جوش ہو کر بولا

"دیکھا تم روشنی ہی روشنی ہو"

"ہاں مگر تاریکی مجھے نگلنے کو بیتاب ہے! میں نے کہا تھا نا میں خود کو ثابت کرنے سے قاصر ہوں"

اس نے ہراساں ہو کر مجھے مٹھی میں جکڑ لیا...... ناتمامی کے درد سے میری آنکھیں چھلک پڑیں

اس نے مجھے بہنے کے لیے نشیب میں چھوڑ دیا اور مسکرایا

"دیکھا تم مایہ ہی مایہ ہو"

"مجھے وقت کی تیز دھوپ جلد خشک کردے گی" میں نے دہائی دی

وہ غصے سے کانپنے لگا...... پھر مجھے سامنے رکھ کر گڑگڑایا

"خود کو ثابت کرو خدارا نہیں تو میں مٹ جاوں گا!

ہماری تکمیل ضروری ہے"...... "ناگزیر ہے! میں نے تائید کی

آؤ میں تمھیں زیب تن کرلوں! نہیں تو ہم تصدیق کے حق سے محروم ہوجائیں گے، ہم کبھی ثابت نہ ہوسکیں گے"

"ہاں ہمیں اپنی تصدیق کرنی ہوگی" اس نے مجھ میں ضم ہوتے ہوئے کہا

......اور پھر ہم نے دیکھا... رنگ... روشنی... سبزہ... مایہ... حسن اور حیرت سب ہمارے بطون کی

جاگیریں تھیں

باہر تو صرف دھواں تھا

چار دیواری میں چنی ہوئی عورت

بند کے اُس طرف خودرُو جھاڑیوں میں لگی رس بھری بیریاں خوب تیار ہیں

پر مرے واسطے ان کو دامن میں بھر لینا ممکن نہیں

اے خدا! جگنوؤں، قمقموں اور ستاروں کی پاکیزہ تابندگی

وہ جگہ، سو رہی ہے جہاں پر چناروں کے اونچے درختوں سے نتھری ہوئی جانفزا چاندنی

...خوشبوئیں خیمہ زن ہیں جہاں رات دن

میری اُن سرحدوں تک رسائی نہیں

اور پچھم کی چنچل سریلی ہوا میرے آنگن سے ہو کر گزرتی نہیں

میں کہ بارش کے قطروں سے نتھرے ہوئے سبز پتوں کے بوسوں سے محروم ہوں

ان کواڑوں کی پرلی طرف دیر سے بند پھاٹک پہ ٹھہرے ہوئے اجنبی

آس اور بے کلی

حرف اور اَن کہی

کچھ نہیں

میں نے کچھ بھی تو دیکھا نہیں

میرے کمرے کی سیلن، گھٹن اور خستہ دواروں کے پیارے خدا

اور کچھ نا سہی

تو مجھے اک گنہ کی اجازت ملے

☆☆☆

آگ کے شکریہ کے ساتھ

مقدس گناہوں میں بھیگی ہوئی رآگ تا پی نہ ہوتی اگر چند پل
زدس کے تنگ ریفریجریٹر میں ٹھٹھرے ہوئے ماس کا پارسالوتھڑا بن کے رہ جاتی!
میں ناجیتی نامرتی پرومیتھیس
اور فرشتوں کی مانند، وجدان پر میرے بھی، عمر بھر بھید گندم کا کھلتا نہیں
آہنی قفل ازلی روایت کے گر میں نہیں ٹوٹتی
کچھ پرندے نہ آزاد ہوتے کبھی
برف ہوتیں مگر خون کی گرم امواج میں تیرتی سُرمئی، سرخ اور نقرئی مچھلیاں
کوئے احساس میں کوئی بجلی کبھی کوندتی ہی نہیں دور تک
اک حقیقت کا بے تاب دل چیرنے
کس طرح پھر چناروں سے لپٹی ہوئی سردتن چاندنی دھوپ بنتی دسمبر میں میرے لیے؟
میں کراچی کے ساحل پہ چلتے ہوئے کیسے گنگا کی لہروں پہ رکھتی قدم؟
کیسے دریاؤں کے دیوتا کی طرح، سوکھی فصلوں کو کرتی تراوٹ عطا؟
کیسے منٹو کے صفحات میں منتشر "نیک بو" سونگھتی؟
(کیسے ناپاک عورت کا سر چومتی)
کیوں ترس کھاتی معصوم دکھ اور فریبِ مسلسل پہ میں، فلورنٹائن کے؟
ان گنت کہکشائیں نہیں کھول پاتیں وہ اسرار جو، کھولتا ہے بدن پر اک آزاد پل
میری آزاد سانسوں کی خالص فضا، میری سنجیدگی
حرف کی یہ طہارت!
پرومیتھیس باخدا
کچھ مقدس گناہوں سے مشروط ہے

یامین

نام: محمد یامین
قلمی نام: یامین
ای میل: yaminesma@gmail.com
فون نمبر: 0345-5322619
تصنیف: دھوپ کا لباس (نظموں کا مجموعہ)

قیدی

پھول تھے اور قہر خوش بو کا
خوف کے گھنگھرو چھن سے بجنے لگے
چاندنی کو فروغ تھا اتنا
رات بھر اس طلسم کا فتنہ
سر اٹھاتا رہا مرے اندر

سحر میں قید۔ آرزو میں گم
سب کے سب ہم
سب کے سب تم
جان جوکھوں میں ڈال کر نکلے
اک کشادہ مکان کی چھت پر
نرگسی چہرے بال کھولے ہوئے
ماتمی سُر میں گیت گاتے ہوئے

اپنا تو دل ہی کانپ جاتا ہے
اس گلی میں ہے بیل پھولوں کی
جس کی خوش بُو پہ سانپ آتا ہے

☆☆☆

بٹن

جلتی رات میں
اس کی سبز قمیص کے اندر
جانے کیا شے
کانپ رہی تھی

کالر سے نیچے
سینے پر اک
سارس رنگ کا
اجلا بٹن اُگ آیا تھا
جیسے کوئی مشروم
ننھی ٹوپی سر پہ جمائے
تھلمل کرتے کھیت کے
سینے سے نکلی ہو

وہ جو کتنے ہی برسوں سے
خود سے بیگانہ تھی
اس دن سے روزانہ
اپنے ہاتھ کی ایک انگلی میں
سرخ گلاب جلا کر
کمرے میں ہر جانب پھیلے
گھور اندھیرے کے بالوں میں
سن سن آگ لگا کر
باہر آ کر
اپنی آنکھیں گیٹ کے اوپر
بلب بنا کر
رکھ دیتی ہے

☆☆☆

سال گرہ

یاد نہیں کیا
بھرے پُرے بازار سے جب میں
خالی خالی لوٹ آیا تھا
اور اک پھول
تیرے چمکتے ہاتھ پہ رکھ کر
میں نے کہا تھا
تیری پسند کے رنگ کا کپڑا
مل نہ سکے تو
میرے کوٹ کی
جیب میں رکھے
نوٹ کی
قیمت گر جاتی ہے

☆☆☆

CamScanner

زندگی

انتظار کے بوجھ سے جھکا ہوا
غصیلی بارش کا ایک دن
آنکھوں میں چھپی ہوئی ایک برفیلی شام
ٹھٹھرتے ہوئے دل میں
محبت کی گرمی جتاتی ہوئی ایک عورت کی باتیں
لمحہ لمحہ قربان ہوتی ہوئی زندگی کا
ایک حصہ
(جسے میں نے اپنے لیے بچانا ضروری جانا)
والد کے چھوڑے ہوئے ترکے سے
شرافت کی ڈھال اور احتیاط کی تلوار اٹھا کر
میں اس میدان میں آ گیا ہوں
جہاں موت کے ساتھ آخری معرکے میں
مجھے شکست ہونے والی ہے

☆☆☆

چوبِ خشک

رات کی خنکی میں ترے آنسو کتنے گرم ہیں
یہ بے کار کی مایوسی کس کام کی
دیکھ! ہرا بھرا جنگل تری تاریخ ہے
جو تیری رنگ بہ رنگ داستانوں سے بھری ہوئی ہے
چھاؤں بھرا درخت تیرا ماضی ہے
اور اس پر۔۔۔ چڑیوں کے وہ گھونسلے۔۔۔ اور گیت
یہ سب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا، لیکن پھر بھی آسمانی یاد میں محفوظ ہے
بعض حشرات اور خطرات تیری موت کا سبب بن سکتے تھے
مگر فنا اور بقا کی یہ جنگ تو نے اب تک نہیں ہاری
مستقبل ترے بدن میں چھپ کر بیٹھا ہے
کشتی، کرسی، میزیں، الماریاں، اور آرام دہ پلنگ
مرد، بچے، عورتیں اور نئی محبت سے مہکتے پریمی جوڑے
لیکن کیا اچھا ہوا اگر ایک بانسری بھی تجھ میں کہیں پڑی ہو
اور وہ سُر جو ابھی ظہور میں نہیں آئے

لیکن میں نے
تیرے اندر اک تابوت چھپا دیکھا ہے
جس پر دیمک کی ایک لکیر
ٹھہر ٹھہر کر کچھ سوچتی جاتی ہے

☆☆☆

پرانے دوست

دل رُبا پتوں سے پریاں
اور ہاتھوں سے ہوائیں کھیلتی ہیں
پاؤں ننھی طشتری میں رکھے
اُڑتے جا رہے ہو
اک ہرے جنگل کے خوابوں سے پرے
پریاں تمھارے ساتھ تصویریں بناتی
گیلری دل کی سجاتی ہیں
کوئی صدیوں کا نغمہ گنگناتی ہے ہوا
تم نے سنا
اور ہنس دیے
دل میں لیے ان جنگلوں کی یاد
جن میں
تم ہزاروں جُگ جیے

پیڑوں کی پیڑھی
پڑھتے پڑھتے
رک گئی ننھی پری
خاک پر رکھ دی کتاب
اے خدائے بوتراب!
کیا کرے علمِ نبات

من میں جب خودرو
شجیرے کِھل گئے
کیسے کیسے گھاؤ دل کے سِل گئے
آج تم کو دیکھنے اس پارک میں
دوست برسوں کے پرانے مل گئے

دھوپ میں ہنستے صنوبر!
آج تیری رونمائی نے
دکھائی ہے خدائی
یہ بتا کتنے زمانوں نے بنائی.... یا گھٹائی
زندگی کی بونسائی

☆☆☆

قصہ خوانی

سن کے بھی چپ ہی رہا
تلخ باتیں، مشکبار افغانی قہوے کے
رسیلے گھونٹ میں گھل مل گئیں
یہ حقیقت اور تھی کہ باپ دادا قصہ گو مشہور تھے
اس لیے وہ چپ رہا

تاریخ کے نقشے میں
جن شہروں کی شہرت گونجتی ہے
وہ خموشی کے اس ازلی رنگ سے ظاہر ہوئے
جس سے شناسائی نہیں ہے
اس ہجوم شور و شر کی

اس نے سوچا
یادگاری چوک میں چاروں طرف
یہ بولتے بازار ہیں
اس لیے افسردگی میں گم کھڑے
اس بید مجنوں پر
نظر پڑتی نہیں
جو اکیلا رہ گیا ہے قصہ خوانوں میں یہاں
بے رنگ اکھڑتی چھال پر

چاقو سے کندہ نام پھیکا پڑ گیا ہے
کندہ کاری جالی ہے خاک سے
وقت کی غفلت نے کیا ثابت کیا
زخم کھانے اور لگانے والوں میں
کون فتح یاب ہیں

شیریں گل!
آ گئے سُنا
کیا سبز آنکھوں میں بھی خاکی خواب ہیں

☆☆☆

سنبھل کر چل

سنبھل کر چل
بہت گہرا اندھیرا ہے
تجھے غاروں میں ایسا غار کم ہی مل سکے گا
یہاں دھرتی نہیں کچھ آسماں سا ہے
درخت اس نیلی چھت کے ساتھ یوں چپکے ہیں
جیسے یہ اسی امبر کا حصہ ہوں
کئی دن سے یہ سب نیلے درخت اس آسماں سے اگ رہے ہیں
ابھی میں تجھ سے کیا کہنے لگا تھا
سنبھل کر، ہاں مجھے کہنا تھا
کہ اس غار سے نکلیں تو شاید آسماں سے ہم زمیں دیکھیں
مگر ہم تو زمیں پر تھے، یہ کیسے آسماں پر آ گئے ہیں
خلا تو اس زمیں پر بھی بہت ہے
مگر ہم آسماں اس کو نہیں کہتے
زمیں تو آسماں پر بھی بہت ہے
مگر ہم اس کو دھرتی کیسے کہہ دیں
چلو اس غار سے ہو کر نکلتے ہیں کسی جانب
سنبھل کر
ہاں سنبھل کر چل
یہاں پر روشنی اتنی زیادہ ہے
کہ آنکھوں میں اندھیرا ابھر گیا ہے

سرکس

وہ دونوں
لپیٹے ہوئے اپنی گردش
لگاتار چلتے ہیں
کم ہی قریب آتے دیکھا ہے ان کو
کبھی ایسا ہو بھی تو ڈرتا ہوں
یک جان ہو کر
یہ دو سے کہیں ایک ہی بن نہ جائیں
بجا، ایک پہیا تو سرکس میں چلتا ہے
جو کر گھماتا ہے
لیکن یہ گاڑی کہاں چلنے والی ہے
جیون کی!

ذرڈر کے
درزوں سے آنکھیں لگاتا ہوں
شاید کبھی دیکھ پاؤں میں یک جان ان کو
اور اپنی یہ پنسل پکڑ کر
بھروں رنگ جیون کے نقشِ خیالی میں!
لیکن کہاں پنسلوں سے یہ جیون کا نقشا بنا ہے
حقیقت کہاں کاغذوں پر اگی ہے
کبھی آگ، پانی سے یک جان ہو کر جلی ہے

زمیں پر اگر ایک گُم دوسرے میں ہوا تو
یہ جانو کہ اب وہ زمیں پر نہیں ہے

میں چھپ چھپ کے
درزوں سے آنکھیں لگا کر
یہی دیکھتا ہوں
الگ اپنے بستر بچھاتے ہیں
بتی بجھاتے ہیں
اور پھر
خوشی کی لمبی سڑک پر
نہ جانے کہاں جا نکلتے ہیں
جیون کی گاڑی کو لے کر-----

☆☆☆

کتوں کی فوڈ اسٹریٹ

آج اتوار نہیں ہے
پھر بھی خالی جگہ اِک پل میں پُر ہو جاتی ہے
چار اٹھتے ہیں
دس آجاتے ہیں
آج ہی کیوں ہم گھر سے نکلے
لسی، مکھن، ساگ، اچار، چاول روٹی
تیتر بوٹی، مرغ تنجن، حیدر آبادی
دادی سب پکوا دیتیں
آرام سے گھر میں کھا لیتے
لیکن تم یہ پرانے کھانے کب کھاتی ہو
اوپر سے یہ دعویٰ بھی ہے
فوڈ اسٹریٹ کے کھانے تازہ ہوتے ہیں
تم بھی ان کا فیور کرتی رہتی ہو
کچھ کچھ فیور موسم بھی کر دیتا ہے

—— ساتھ چپکنے سے کیا ہوگا
ہر شے دانت بجاتی خنکی نے سُن کر دی ہے
سب ٹھنڈا ہے
بھوک بہت ہے لیکن جی متلاتا ہے
اندر اندر
کسی کھردرنچ کا زخم ہے جو تڑپاتا ہے

—— آج کسی بھی میز کے نیچے مال نہیں ہے
بھوکوں کا کوئی حال نہیں ہے
آج بھی شاید پیزے سے
تا کیزے کو کوئی دانت ملا ہے
کافی خوش ہے
پیٹ میں دوزخ جھونک رہا ہے

—— ویٹر کے بھی کان نہیں ہیں
سُن تو لے
کون کہاں سے بھونک رہا ہے

☆☆☆

جب بھی شاعری کے انتخاب کا ذکر چلتا ہے تو ہمارے ذہن میں فوراً غزل آتی ہے کہ ہمارے ہاں ابتدا ہی سے غزل نے انتخاب کے لفظ پر قبضہ کر رکھا ہے۔ نظم کا انتخاب اور وہ بھی جدید تر نظم کا انتخاب، ایسا خیال ہمارے دوست نعمان فاروق ہی کو سوجھ سکتا ہے، جن کا تعلق چکوال کے ایک دور افتادہ مگر سرسبز و شاداب گاؤں سے ہے۔ نعمان فاروق خود بھی غزل کے بہت اچھے شاعر ہیں اور ان کی غزلوں کا مجموعہ ''سورج کی چھاؤں'' شائع ہو کر ادبی حلقوں سے دادِ تحسین سمیٹ چکا ہے۔ ان کے یہ اشعار دیکھیے:

جب رکھے پاؤں اس نے پانی میں
آ گئی موج بھی روانی میں

پیاس کے ہاتھوں مرا قتل ہوا ہے نعمان
دوست دریا تھے مگر پاس نہ آیا کوئی

اُس کی خوشبو کی چاپ سنتے ہی
پھول کھلنے لگے تھے بیلے میں

انھوں نے اس سے قبل پچھلی صدی کی آخری دہائی میں ابھرنے والے بیس اہم غزل گوؤں کا انتخاب کر کے ہمیں حیران کیا۔ ''غزل زندہ رہے گی'' کے نام سے شائع ہونے والا ان کا یہ انتخاب آج بھی ادبی حلقوں میں زیرِ بحث ہے۔ اب انھوں نے اسی دور کے بیس اہم نظم گو شعرا کو منتخب کیا۔ شعرا کی فہرست سے ممکن ہے بعض دوستوں کو اختلاف ہو اور ایسا ہونا بھی چاہیے کہ انتخاب شعر بہت حد تک ذوقی معاملہ بھی ہے، لیکن یہ اختلاف اس کتاب کی اہمیت کو کسی صورت کم نہیں کرتا۔

ایک غزل گو شاعر کی نظم پر اتنی گہری نظر۔ میں حیران بھی ہوں اور خوش بھی۔ مستقبل میں جدید تر نظم پر قلم اٹھانے والا کوئی بھی ناقد اور ادبی مورخ اس انتخاب کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

وحید احمد

کہتے ہیں نظیر اکبر الہ آبادی کا زمانہ غزل کا زمانہ تھا۔ محبوب صنف غزل؛ مگر وقت کا کچھ اور ہی تقاضا تھا۔ نظیر اُس جانب متوجہ ہوئے تو نظم اُن کی مدد کو موجود تھی۔ یہیں سے اس صنف کی مقبولیت کے امکانات بڑھتے چلے گئے۔ اقبال تک آتے آتے نظم روایتی موضوعات سے نکل کر بات کہنے کے کئی قرینے سجھا چکی تھی۔ ن م راشد، میرا جی، مجید امجد اور فیض نے نظم کو ویسا ہی تخلیقی اعتبار بخشا جو صرف غزل کا نصیب ہوا کرتا تھا اور ایسا کئی پابندیاں توڑ کر ممکن ہو پایا۔ اب نظم کی دھج غزل سے بالکل الگ تھی۔ منیر نیازی، اختر حسین جعفری، وزیر آغا اپنے اپنے رنگ سے نظم کہہ کر متوجہ کرتے رہے۔ افتخار جالب، انیس ناگی، جیلانی کامران، ساقی فاروقی، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید وغیرہ سے ہوتی نظم جب علی محمد فرشی، نصیر احمد ناصر، وحید احمد، ابرار احمد، رفیق سندیلوی، اقتدار جاوید، انوار فطرت اور حارث خلیق تک پہنچی تو یہ تاثر دیا جانے لگا کہ شاید بات آگے نہیں بڑھ رہی۔ ایسے میں نئی نسل کے اہم شاعر نعمان فاروق سامنے آ کر ایسے توانا نظم نگاروں کو نشان زد کر رہے ہیں جن کا تخلیقی سفر گزشتہ صدی کی آخری دہائی میں آغاز ہوا تھا۔ جی، یہ وہ نظم نگار ہیں جو رواں منظر نامے میں نہ صرف اپنی شناخت مستحکم کر چکے ہیں، یہ بھی ثابت کر رہے ہیں کہ نظم کا سفر رُکا نہیں بلکہ اس نے ایک نئی تخلیقی کروٹ لے لی ہے۔

"غزل زندہ رہے گی" کی طرح نعمان فاروق کا تازہ اِنتخاب "نظموں کا دَر کھلتا ہے" چاہے بعضوں کے لیے ایک ذوقی معاملہ ہو کر دو تین ناموں یا تخلیقات پر اختلافی ہو مگر میرے لیے اختلافی ہو کر بھی بہت اہم ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہیں کہیں ۹۰ کی دہائی کے بعد کی نظم کی شناخت متشکل ہوتی ہے اور یہ کہ غزل کے انتخاب کی طرح نظم کا یہ انتخاب بھی ایک مثبت مکالمے کو آغاز دِے سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو مجھے یقین ہے کہ مابعد جدید نظم کے تخلیقی امتیازات بھی نشان زد ہوتے چلے جائیں گے۔

محمد حمید شاہد

Misaal
PUBLISHERS
misaalpb@gmail.com
Ph:+92-41-2643841, Cell:0300-6668284

9789695813904